زعفران کے پھول

مصنف کی دوسری کتابیں

ایک لڑکی
کہانیاں

یہ امرت ہے
ڈرامہ

محمد علی

مسافر کی ڈائری

فاشیت اور جنگ حبش

زبیدہ
ڈرامہ

زیر طبع

پاؤں میں پھول
کہانیاں

پرچم
ناول

زعفران کے پھول

اور

دوسری کہانیاں

خواجہ احمد عباس

کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی

زعفران کے پھول

کرشن چندر کے نام

زعفران کے پھول

آؤ، مسافر یہاں! اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں ... وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے تمھاری؟ ... پنکچر ہو گیا ہے؟ ... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے ... اب بیس کوس کی تو بات ہی ہے ... نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہئے۔ اور پھر پیسے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟ ... اکیلی جان ہوں، ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں، پنپنے سے پاں بھرتی ہوں، دھان کوٹ دیتی ہوں، اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے۔ پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی۔ اور چاہئے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن ... تم بھی کہتے ہوگے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا۔ ہے ... ...

کیا کہا تم نے، بیٹا؟ ... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے۔ ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھول بیچ بیچ کا سنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں سفید پھول بھی پاؤ گے ... پہ

یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں ... ... اس کی وجہ کیا ہے ؟ ... ... یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان، خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بے وقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں ... ...

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے ؟ ... ... ابھی تمھاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی ... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا! پل دو پل کو ٹھیرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی۔ یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے، اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دسترخوانوں پر مہکے گی۔ اور تمھاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟ ... ... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہونا ؟ ... ... دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے ... ... ہے نا ؟ ... ... پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟ ... ... یا ابھی تمھاری موٹر درست ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟ ... ... خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو ... ...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تماسی سال لگے ہیں پہلے

یہاں بھی کاسنی پھول ہی اگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار آجاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلھن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی یہ خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے ... ...

تمھاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا ... ... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا بے چارہ، کھیت میں جاکر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا، اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے۔ جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔

کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو"

تو جواب ملا

"ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو ... "

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ وہ بے چارہ کتابوں میں یہ پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آگئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے، اور وہ جلی بھلی تو کھسیانا

ہو گیا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تین ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

... ... میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ... ... بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں ... ... ہاں تو زعفرانی ... ... کیا کہا ... ... زعفرانی کون ؟ ... ... ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی ... ... نہیں بتایا تھا ؟ ... بھول گئی ہوں گی ... ... لو دیکھ لو یاد کا یہ حال ہے بیٹا ... ... ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا، مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی، لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی وہ اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!! ... ... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں ... ... ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوب صورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں، مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی وبصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دُبلی تھی جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی؟ اور پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ ویسے پھٹے ہوئے اوپر

سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں، نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھما چوکڑی
سے مطلب، میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی وہ
بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا
میں سوچتی، ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا۔ پر وہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی
ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا ... ... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں
بیٹا ... ...

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے
اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا بھلا ایک معمولی
کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون بر مل سکتا تھا؟ ... ... میں نے سوچا زعفرانی
کی قسمت کھل گئی ... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا اُس سال جاڑے کے
موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اُسے جنت نصیب
کرے۔ اس کا مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہو گئیں مرنے
والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہو گئی۔ اس پر بھی
میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے جو تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے
میری اصل پونجی تو میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی
کہ غریب اور یتیم لڑکی کو کون بیاہے گا۔

... ... سینکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آ رہے
ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بُری۔ کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی اتنا
پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں۔ کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں کبھی برف

میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے۔ اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجہ پرجا کا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہو ہی جاتی ہے۔ مگر شیخ کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے ...
... کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نور و چلاتا ہوا آیا۔

"ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں! شیر کشمیر"

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو ذیلدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آدیں ... تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو ——— کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہوگا، تبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں ... ...

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر ۔ اسے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ——— ایک اسکول ہے ——— اب تو مڈل تک کا ہو گیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی ——— ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور سامنے نہ شیر نہ چیتا، ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لو جی یہ تھا وہ شیر کشمیر ... ... میں نے کہا: لو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں سا ہے۔ بھلا افسر کہیں

گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا، اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہوگا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا تو ار کو سکے بھونپو بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا، اسی انتظار میں میں بھی وہاں بیار کھڑی ہوگئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا۔ اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے وہ چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہئے۔ لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے۔ اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی ہی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کے اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں ... ...

تم تو جانتے ہی ہو تالاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو۔ سارے پانی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا، یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھیرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام چین، صلح شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین۔ جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت

ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں، اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمھارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمر بس انھیں راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے روکھی سوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں، تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہوئے ہو ... پر میری کون سنتا ہے، بیٹا ... وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی ایسا کیا تھا .. ... تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟ ... ... وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں، ہاں، بیٹا۔ اسی کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کہتے ہو گے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھیرے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے ... ... یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم تو بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے۔ اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پر تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں۔ اور ایسی باتیں کرنے والوں میں سب سے آگے آگے میرے ہی لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور نمبردار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو سینے کے بینے پڑ جاتے ... ...

... جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے ان کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر سینگ اٹھا ادھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی۔ بڑا غلام نبی کہنے لگا میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب گیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا چھ مہینے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے کہیں زیادہ پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ کندھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڈھا جہاں بوجھ سنبھالنے کے لئے مزدور پٹا باندھتے ہیں۔ اور رات بھر کھانسنا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اٹھانے والوں کے کاندھوں پر ایسا گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا۔ بیچ میں بارش آ گئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے ... ... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا نورو بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نورو کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا نورو شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں گشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی منڈی کو بھی زکام ہوا وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کی ان کے حق پہ کرنے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے

لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ
لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا۔ نہ میں اس کی ماں ... ...

... زعفرانی ؟ تو اس کا تو ذکر ہی کرنا بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے
گھر میں رہ ہی گیا تھا کون۔ بس میں۔ زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی
اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات
چیت کروں۔ اور یہاں اول تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سنا سمندر پار ولایت
میں لڑائی شروع ہو گئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ پوچھو مت۔ میں اور زعفرانی
دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے،
کبھی پانی بھرتے۔ کبھی اون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا۔
غفورا دس برس کا ہو گیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں
ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے۔ پر وہ
ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے
میں داخل کروا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں۔ پھر
اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی ... ...
مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے۔ اب نہ جانے کون
سی مصیبت آئے گی ... ... پر بیٹا اس لونڈیا پہ تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا
دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی ... ... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر
پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا
تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے ... ...

... جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے بٹیا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں
.... بیس اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں حور کا بچہ نہیں تھی تو کانی
بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی۔ اور تم جا نو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے
سینما، بائسکوپ، ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کیسے آوارہ ہو گئے ہیں
ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آ
رہی ہے۔ زار و قطار روتی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، تو کچھ جواب نہیں
بس روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا،
گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اس کا جواب سن کر میں تو دنگ رہ گئی بٹیا
بات ہی اس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی
ہوگی۔ کہنے لگی۔

"ماں! میرا بیاہ کر دو"۔ اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات
کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ ذیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور
لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اسے چھیڑنے اور اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا
تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بدارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ بڑی مصیبت سے ہاتھ
چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول بیٹھی ہوئی تھی،
دل میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اور رو رہی تھی۔ اور جب
ہچکیاں ذرا رکتیں تو یہی کہتی۔

"ماں میرا بیاہ کر دو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں
مل جائے گی ... ..."

.. ... اب تم ہی بولو بیٹا، غریب عورت کرے تو کیا کرے جب دمڑی
پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے ... ... پھر بھی میں نے ادھر اُدھر نگاہ
ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ دے،
تو یہ فکر تو دور ہو جائے ۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہیئں ۔ زمین زیور
یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے ۔ اب
تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا ۔ اسی ادھیڑبن میں لگی ہوئی تھی
کہ ایک دن ایک آدمی آیا ۔ شکل صورت سے بیچارہ قلی معلوم ہوتا تھا ۔ وہی ماتھے
پر پیٹے کا نشان ۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی ۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا ۔ کہنے لگا ۔
" غلام نبی نے یہ بھیجا ہے ۔ میں اس کا دوست ہوں محمدو " ۔ یہ کہہ کر ایک
میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی ۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور پیسے
اور کچھ ریزگاری ۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے ۔ وہ بولا ۔
" غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا ۔ اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ
کر دیں "

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا ۔ پھر
محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا ۔
" غلام نبی کا کیا حال ہے ؟ وہ نہیں آیا ؟ "
محمدو کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ ٹھیر ٹھیر کر بولا جیسے
بولنا نہ چاہتا ہو ۔
" ماں جی! غلام نبی تو چل بسا ۔ اُسے دق ہو گئی تھی " ۔ اور بس چپ ہو گیا

.. .. بیٹا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے ... ... ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو ۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا ۔ دو سال دودھ پلاتی ہے ۔ بچہ اس کے خون اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے ۔ اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے ۔ اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے ... ... اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے ... ...

میرا تو، جو حال ہوا سو ہوا۔ زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا ۔ چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی اور بھی فکر پڑ گئی ۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کہ پڑھ ۔ تختی لکھ ۔ مدرسے کا کام کر ۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی ۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے ۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے ۔ نہ جانے کیوں؟ ... ...

ہاں اور محمدو کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری دنوں کا سب حال کرید کرید کر پوچھا ۔

" کب اور کیسے بیمار پڑا ؛ علاج ہوا یا نہیں ؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے ؟ "

اور جب محمدو نے کہا ۔

" ہاں بہت سوں کو " ۔ تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا

"تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟"... ... نہ جانے کیوں ... ...

... ... میرے کہنے سے محمدو ہمارے ہاں تین دن اور ٹھیرا۔ جب روانہ وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا

"کیوں محمدو! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا۔

"چھوڑ کر کیا کروں گا، ماں جی؟ - اور کوئی کام آتا نہیں ہے - اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ نہ ماں نہ باپ ..."

میں نے جلدی سے پوچھا

"اور بیوی؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کب کی مر گئی"

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں پر میں نے کہا۔

"دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟"

اس کو تین دن میں میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ہوئی اور اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں۔

"مجھ سے کون بیاہ کرے ہے، ماں جی؟"

... ... تو بیٹا یوں زعفرانی کا بیاہ محمدو سے طے پایا۔

... کیا کہا ؟ زعفرانی کی رائے ؟ ... ہیں بھلا شادی بیاہ کیا ...
لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پرمیں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی
بیسویں کو محمدو اسے بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سن کر خوش
ہو گئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پہ خوش ہوا کرتی ہیں ... پر اس
کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہو گئی ہو۔
... شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹا، آخر ...
ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی
کے بالے ہوں۔ جس دن محمدو آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے سے ہی
زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور
اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کی کشمیری
عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر انہی شیر کشمیر کے کہنے سے
آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی
تو مجھے بھی مجبور کرتی تھی کہ ماں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر
کے ڈر سے میری بلا، پر اور عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی تھیں۔ سو میں نے
سوچا میں ہی کیوں نکو بنوں۔ سو میں نے بھی سلوا لی ... ...
... اتنا غصہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا ...
تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بیٹی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے
گاؤں میں شور مچ گیا، شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے، مجھے کیا پتہ
کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا ... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے

قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا ۔۔ ۔۔۔ پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب کے اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔ اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمود اور اس کے ساتھی بسات لائے ہوں مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لئے "شیر کشمیر زندہ باد ۔۔ " ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے۔ اور ہمارا نور دو چار اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا ۔۔۔ ۔۔۔ ک ش م ی ر چھ وڑ دو " ۔۔۔ ۔۔۔ اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اس نے کوئی بڑا کام پورا کیا ہو۔

۔۔۔ ۔۔۔ ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی، اور اس میں سے سپاہی کود کود کر بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے۔ میں دیوار کی طرف دوڑی، جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہوا کھریا سے لکھ رہا تھا۔ پر غفورا وہاں نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا ۔۔۔ ۔۔۔ میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اس نے جان دے دی۔ اور بے ہوشی میں

بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی حرفوں کو دہراتے رہے جنہیں وہ بار
دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ک ش م ی۔ اور ابھی ر نہیں کہہ
پایا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی۔ اور اس مہینے میں دوسری بار
مجھے موت آنی پر آئی .. ...

.. ... اور اس کے بعد کیا ہوا، بیٹا، یہ مجھے ایسا یاد ہے، جیسے کوئی
ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی
تعلق نہ ہو، مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اٹھتا چلا جائے ... ...

... ... زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں
اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں ... ... آنسوؤں کا نام
نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی ...

.. ... اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے
آگے عورتیں۔ اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی
کا جوڑا پہنے ہوئے۔ اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ۔ اور یہ سارا
مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا۔ جہاں بالکل
اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے، سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

... ... بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور
ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف، زعفرانی
کی طرف دیکھ رہی تھیں ... ...

... ... ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر

بھاگے ۔ اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی
زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گر گئی جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے
میں ادھر بھاگی ۔ پر جب تک میں پہنچوں ، زعفرانی کی چھاتی میں سے خون
کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی ...
... عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کے بجائے خون ... ...
خون مٹی میں مل رہا تھا ... ...
اور میری بیٹی میری گود میں جان دے رہی تھی ۔ پر مرتے دم تک
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی ، اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے
اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا ۔
" میرا بیاہ ہو گیا ماں "
... ... یہیں اسی کھیت میں جہاں تم اب گل لالہ کی طرح سرخ
زعفران کے پھول دیکھتے ہو ۔
... سنی بیٹا ، تم نے میری کہانی ؟ ... ... پر تم کہاں ہو ؟
... ... چلے گئے نا تم ؟ ... ... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمھاری موٹر
ٹھیک ہو جائے گی اور تم لوگ چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سن پاؤ گے
... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گذرتی ہی رہتی ہیں ۔ بیٹا ،
پل دو پل کو ٹھیرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں
پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت
آجائے گا ۔ اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو

بھیج دیئے جائیں گے۔ اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس
کے دسترخوانوں پہ سے مہکے گی۔ اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں
گے کہ " اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے ؟ ... ... پر کوئی
نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں ... ...

اجنتا

سردار جعفری کے نام



اجنتا

"اجنتا ہندستان کے آرٹ کی معراج ہے، دنیا میں اس کا جواب نہیں ہے ... بڑے بڑے انگریز اور امریکن یہاں آکر دم بخود رہ جاتے ہیں ... یہ غار ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہیں۔ ان کو کھودنے، تراشنے، ان میں مجسمے اور تصویریں بنانے میں کم سے کم آٹھ سو برس کا عرصہ لگا ہوگا ... بھاگوان بدھ کے اس مجسمے کو دیکھئے ... ..."

سرکاری گائیڈ کی منجھی ہوئی آواز غار کی اونچی پتھریلی چھت سے ٹکرا کر گونج رہی تھی۔ اٹھائیس روپے ماہوار تنخواہ اور روپیہ ڈیڑھ روپیہ روزانہ "بخشش" کے عوض وہ اپنا طوطے کی طرح رٹا ہوا سبق دن میں نہ جانے کتنی بار دہراتا تھا نرل کو اس کی آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے رہٹ چل رہا ہو، یا چرخہ یا کولھو۔ روں، روں، روں، روں ـــ ایک بے معنی، بے روح آواز کا لامتناہی سلسلہ جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔

بھارتی ـــــ جو آرٹ کی پرستار بھی تھی اور خود آرٹ کا ایک نادر

نمونہ بھی ـــــ گائیڈ کے الفاظ پر سر دھن رہی تھی ۔ ہزاروں برس پرانے آرٹ کے اس اتھاہ سمندر میں وہ ڈوب جانا چاہتی تھی ۔ ہر تصویر، ہر مجسمے، ہر ستون ہر محراب، ہر پھول اور پتی کو دیکھ کر اس کے منہ سے تعریف کا چشمہ بے اختیار پھوٹ نکلتا تھا ـــــ "اوہ نرمل یہ دیکھو ... اوہ نرمل وہ دیکھو ...
... مہاتما بدھ کے چہرے پر کتنا سکون اور شانت ایکسپریشن ہے ... اس اپسرا کے بالوں کا سنگھار تو دیکھو ... ہاؤ سویٹ ... کتنا سندر ... ہاؤ ونڈرفل ... "

نرمل خاموش تھا ۔ وہ نہ گائیڈ کی روں روں سن رہا تھا اور نہ بھارتی کے پرجوش تعریفی جملے ... اس کی نگاہیں دیوار پر بنائی ہوئی تصویروں پر ضرور تھیں ۔ مگر اسے سوائے دھندلے رنگین دھبوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ... اس کے کان گائیڈ کی رٹی ہوئی تقریر کو سن رہے تھے، پر اب تک وہ صرف آواز تھی ۔ بے معنی ۔ دھیما دھیما شور ۔ چرخے یا کولھو یا رہٹ کی روں روں کی طرح ... بھارتی جب بولتی تو نرمل کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے کانوں پر کوئی غیر متعلق اور قطعی غیر ضروری چوٹ پڑی ہے ... جیسے گرمی کی دوپہر میں تانبے کی طرح تپتا ہوا آسمان ایک اڑتی ہوئی چیل کی ہیبت ناک چیخ سے گونج اٹھے ...

نہ جانے وہ کس زمانے کے غار میں تھے ۔ نہ جانے وہ کس تصویر کے سامنے کھڑے ہوئے تھے ... ...

گائیڈ کی روں روں جاری تھی ... یہ دیکھئے ایک پچھلے جنم

ہیں۔ سنیاسی کے روپ میں مہاتما بدھ آدرش بنے ہوئے ہیں۔ بنارس کے راجہ
کی بے رنگی [illegible] مہاتما بدھ کا اپدیش سنتا ہے . اسے جب یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ
خود جا کر سنیاسی سے سوال جواب کرتا ہے .. ... تم کون ہو اور کیا اپدیش
دے رہے ہو؟ .. وہ کہتے ہیں میں شانتی اور سچائی کا ذکر کر رہا ہوں ..
.. راجہ اپنے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ وہ سنیاسی کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان تلوار
سے کاٹ ڈالے۔ پھر بار بار مہاتما بدھ نے یہی کہا کہ شانتی اور سچائی تو میرے دل
میں ہے ناک، کان، ہاتھ، پاؤں میں نہیں ہے .. یہ دیکھئے ان کے
زخموں سے خون . .. "

خون!

گنگا کی لہریں، پاکیزگی، لامتناہی [illegible] میں سے اس اپاسک نے نرمل
کے دامن [illegible] کی طرح ایک چیخ نکالی

خون!

اجنتا کے غاروں کی پتھریلی دیواریں یک لخت خلا میں تحلیل ہو گئیں
— اب وہاں نہ مجسمے تھے نہ تصویریں نہ ستون — نہ گنگا اور نہ
جمنا — نہ [illegible] نہ وہ شور کے ساتھ بہنے والی ندی —
— نہ آرٹ اور نہ تاریخ — نہ دھرم اور نہ مذہب — نہ مہاتما بدھ
اور نہ بنارس کا ظالم راجہ ...

خون!

خون کی ندیاں۔ خون کے دریا۔ خون کا سمندر۔ اور ان خونیں لہروں پر

بہتا ہوا ٹرک جب بمبئی واپس پہنچ گیا۔ وہی خونی بھی جب تھے۔ بھاگ کر اس نے
تین سو میل پیسے اور ڈیڑھ ہزار برس پرانے غاروں میں پناہ لی تھی ۔۔۔

بلکہ ستمبر ۔۔۔ شام کو حسب معمول وہ اپنا کام ختم کر کے گھر آ … جیسے
دوست وسنت کے دفتر گیا تھا کہ دونوں ساتھ ہی ٹرین سے واپس جائیں گے کہ
خبر آئی کہ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ کام چھوڑ کر ہر کوئی اس مضمون پر
رائے زنی کرنے لگا۔

"تم دیکھنا یہ فساد چند گھنٹوں میں دب جائے گا۔ اس بار تو ۔۔۔ نے
تیاریاں کر رکھی ہیں ۔۔۔"

"یہ آج کیسے ہو گیا؟ ۔۔۔ مسلم لیگ کا … ہندوؤں کا … دونوں
کرنے والی ہے ۔۔"

"یہ کلکتہ کے جھگڑوں کا اثر ہے ۔۔۔"

"سنا ہے کئی ہزار مجرم پکڑے گئے ہیں"

"سنا ہے گول پیٹھا پر پنڈت جواہر لال نہرو کی تصویر کو ایک مسلمان
جوتوں کا ہار پہنا رہا تھا۔"

"سنا ہے بھنڈی بازار میں مسلمانوں نے کئی ہندوؤں کو مار ڈالا۔"

"تم فکر نہ کرو، اب کے ہم … جھکنے والے نہیں ہیں۔"

اتنے میں اس … کار … … … کا … … کے
سامنے ہرکشن داس اسپتال کے دروازے … ہو رہی تھی
ایک ننگے ہوئے جسم کے راہ گیر نے … … اور کالی مرچ

ٹوپی پہنے ہوئے تھا، اسپتال کے دربان سے پوچھا
"یہ کون تھے؟ ہندو یا مسلمان؟"
دربان نے جو موٹر میں جھانک چکا تھا جواب دیا۔
"ایک مسلمان، دو ہندو،"
اور فوراً کونے کے ہندو ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

ساری چرنی روڈ پر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ہوٹل کے سب دروازے بند تھے۔ صرف بیچ والے لوہے کے پھاٹک کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ شام دیر ہوئی شروع ہو چکی تھی سڑک پر سناٹا تھا۔ ہاں اوپر کی منزلوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ دنیا میں ایک عجیب تناؤ تھا جیسے سہا ہوا دل چوٹ پڑنے کا منتظر ہو"

یکایک سینڈہرسٹ روڈ کے چوراہے کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہر شخص کی نگاہیں آواز کی سمت پھر گئیں۔ ایک دبلا سا نوجوان کرتا پاجامہ پہنے آ رہا تھا۔ بالکل بے فکر جیسے شہر میں فساد ہوا ہی نہیں تھا۔

"سالے کی ہمت تو دیکھو!"۔ ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے گروہ میں سے ایک آدمی نے کہا اور گٹھے ہوئے جسم کے آدمی کا ہاتھ دھاری دار قمیص کے نیچے اپنی میلی دھوتی کی تہوں میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا۔

بے فکر دبلا نوجوان اب وسنت کے دفتر کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ نرس نے دیکھا کہ اس کے ململ کے کرتے میں سے اس کی ہڈیاں نظر آ رہی

ہیں۔ سانولا سا رنگ، چھوٹا سا قد، مگر اچھا ذہین چہرہ۔ کوئی کلرک یا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں نرمل کا جی چاہا، چلا کر کہے۔ "میاں بھائی ذرا سنبھل کے آگے جانا۔ بڑا خراب وقت ہے" ۔ پر اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اور چشم زدن میں اس نے ایک چمکیلی چھری کو ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔

چھری دستے تک دبلے پتلے نوجوان کی کمر میں اتر گئی۔ اس کے ہاتھ ایک بار بے اختیار اٹھے، شاید بچاؤ کرنے کے لئے، مگر اگلے لمحے میں وہ چکرا کر گر پڑا۔ اور اس کے منہ سے ایک کراہتی ہوئی آواز نکلی جو فریاد بھی تھی اور آخری ہچکی بھی۔

"ہائے بھگوان"

اور ہوٹل کے سامنے کے مجمع میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

"ارے یہ تو ہندو ہے ہندو"

"نہیں رے سالا بن رہا ہے"

"پاجامہ پہنے ہندو کیسے ہوسکتا ہے؟"

"سالے کا پاجامہ کھول کر ختنہ دیکھیو"

چھری ابھی تک نوجوان کی کمر میں گڑی ہوئی تھی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی آدمیوں نے بڑھ کر سسکتی ہوئی لاش کو پلٹ دیا اور ایک نے کمر بند کی ڈوری کو کھینچ کر گرہ کھول دی۔

نرمل کی آنکھیں شرم سے بند ہوگئیں، اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے غلاظت کے ڈھیر میں اس کا منہ رگڑ دیا ہو۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل لاش کو پھر الٹ کر زخم میں سے اپنی چھری باہر کھینچ رہا تھا۔

"یہ تو مشٹیک ہو گیا"

اس نے کہا۔ اور اپنی میلی دھوتی میں سے ایک کترن پھاڑ کر اس سے چھری کا خون پونچھنے لگا۔

چھری جب زخم سے باہر نکلی تو نرمل نے دیکھا کہ زخم سے سیاہی مائل گاڑھا گاڑھا خون بہہ نکلا۔ اور مقتول نوجوان کے کپڑوں کو رنگتا ہوا سڑک پر پھیل گیا ... ...

خون!

"خون خرابے، فساد دنگے سے دور یہ کتنی سندر اور شانت دنیا ہے نرمل؟"

بھارتی نے نرمی سے، پریم سے نرمل کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ایک جھٹکے کے ساتھ ایک لہر نے اسے خونی سمندر کے باہر کنارے پر لا پھینکا۔

"کیا۔ کیا کہا تم نے بھارتی؟"

"میں کہہ رہی تھی کہ اجنتا کے ان خاموش پرسکون نظاروں میں ہم بمبئی کے خون خرابے سے کتنی دور معلوم ہوتے ہیں۔ کئی ہزار برس دور، یہاں تم ضرور ان فسادات کے نظاروں کو بھول سکو گے جو تم نے بمبئی میں دیکھے ہیں ..."

بیچاری بھارتی! حسین اور حسن پرست بھارتی! اس کا دل پریم سے کتنا

بھرپور تھا اور اس کا دماغ سمجھ بوجھ سے کتنا خالی، اسے نرمل سے واقعی محبت تھی اور وہ اسے ایک منٹ کے لئے بھی دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جس دن فساد شروع ہوا اس سے اگلے دن ہی وہ جان گئی کہ نرمل کا نازک اور حساس دماغ اس خون خرابے کی تاب نہیں لا سکتا۔ چرنی روڈ کے خون کے بعد جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا نرمل نے تین دن کھانا نہ کھایا اور نہ ہی وہ سو سکا۔ اس کو چپ سی لگ گئی تھی اس کے دل و دماغ پر ایک گہرا [illegible] تھا اس نے کسی کو اس کی وجہ نہ بتائی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا بھی تو اس نے ٹال دیا۔ پر بھارتی سے وہ ہر بات کہہ دیتا۔ اس کی گود میں سر رکھ کر نرمل نے اس خونیں واقعہ کی تمام ہولناک تفصیل اس کو سنا دی۔

"اس دبلے پتلے نوجوان کی صورت اب میری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے، بھارتی اس کی آخری چیخ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے، اس نے میری نیند اڑا دی ہے۔ رات کو سوتا بھی ہوں تو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں ایک خون [illegible] ڈوب رہا ہوں، اور کوئی میری مدد کو نہیں آتا۔"

[illegible] اپنی [illegible] انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بھارتی نے کہا۔

"[illegible] پیارے نرمل"

اپنی [illegible] نے اپنے دوست [illegible] واقعہ کو [illegible] کی کوشش کی [illegible] بھی نرمل کی شگفتگی اس کی مسکراہٹ اس کی حاضر جوابی سب سے غائب

ہو گئی تھی۔ وہ جب کبھی بھارتی سے ملنے آتا تو گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا اور اس کی وحشت بھری آنکھیں ٹکٹکی باندھے فضا میں نہ جانے کیا دیکھتی رہتیں۔ وہ کہتی —

"میں جانتی ہوں، نرمل تمہارے حساس دماغ کو کتنا گہرا گھاؤ لگا ہے، مگر ہمیں اپنے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، اور اس واقعہ کو بھلانے کی کوشش کرو۔"

وہ چپ رہتا۔

"ہاں بھول ہی جانا چاہئے" اور وہ سوچتا — "کون کون سے واقعات بھلانے کی کوشش کروں؟"

نرمل کو قدرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل اور دماغ ملا تھا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں، مضامین، انشائے لطیف اور افسانے ملک کے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے باپ کی بیٹی بھارتی اس کی ادبی قابلیت [illegible] راج تھی۔ اس کا [illegible] کے لئے [illegible] جو [illegible] خو [illegible] ادبی جہاں وہ سکون سے [illegible] [illegible] ایک [illegible] روزانہ اخبار [illegible] رپورٹر تھا [illegible] [illegible] اختیار کرنا [illegible] تھا۔

نرمل کہتا "موجودہ ہندوستان میں ادبی تخلیق صرف دماغی [illegible] ہے اور لکھنے والے کے لئے اخبار نویسی ہی پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ رپورٹر کی حیثیت سے وہ زندگی کے ڈرامائی عناصر سے دوچار رہتا

عدالت کے مقدموں، تھانے کوتوالی کی وارداتوں، [illegible] [illegible]الوں،
جلسوں اور جلوسوں میں اس کو انسانی سیرت کا مطالعہ [illegible] اور [illegible] اور یہی
مشاہدات اس کے تخلیقی سانچے میں ڈھل کر ایسے مضامین، افسانے، اور نظمیں
بن جاتے تھے جن میں زندگی کی [illegible] زندگی کی [illegible] اور زندگی کی [illegible] نظر
آتی تھی۔

رپورٹر کی حیثیت سے نرمل کو فساد کے زمانے میں بھی [illegible]
میں گھومنا پڑتا تھا — سینڈہرسٹ روڈ، بھنڈی بازار، پائیدھونی، بائیکلہ، پریل
دادر۔ سارا شہر میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ ہر محاذ پر خون اور قتل کے واقعات ہو
رہے تھے۔ یہاں ایک مسلمان ڈبل روٹی والا مارا گیا۔ وہاں ایک ہندو دودھ
والے کو کسی مسلمان نے چھرا گھونپ کر مار ڈالا۔ یہاں ایک پٹھان کا خون ہوا۔
وہاں ایک پوربی بھیا قتل ہوا۔ یہاں ایک دس برس کے بچے کو کسی نے ذبح
کر دیا۔ وہاں ایک گیارہ برس کے بچے نے ایک راہ چلتے آدمی کی پسلیوں میں
چاقو بھونک دیا۔

سارا شہر ہندو بمبئی اور مسلمان بمبئی میں منقسم ہو گیا۔ کسی ہندو کی
جرأت نہ تھی کہ بھنڈی بازار میں قدم رکھ سکے۔ کسی مسلمان کی [illegible] نہ تھی کہ پائیدھونی
سے گزر سکے۔ پاکستان اور ہندوستان تو [illegible] بن گئے تھے [illegible]
رپورٹر نرمل کو اکثر پولیس یا فوج [illegible]
ایک [illegible] سارجنٹ [illegible] کہا۔
"تم کانگرسی [illegible] چاہتے [illegible] پاکستان

قائم ہے یا نہیں ؟"

اگلے دن ایک انگریز تاجر نے نرمل اور اس کے ساتھی رپورٹروں سے کہا۔

"تم لوگ تو کوئٹ انڈیا کا نعرہ لگاتے تھے نا ؟ ہم سے کہتے تھے نکل جاؤ ہندستان چھوڑ دو۔ اب ہم چھوڑنے کو تیار بیٹھے ہیں تو ہماری خوشامد کرتے ہو، کیوں ہمارے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو ؟ ہماری حفاظت کا مطالبہ کرتے ہو ؟ ہندو کہتے ہیں ہمیں مسلمانوں سے بچاؤ، مسلمان کہتے ہیں، ہمیں ہندوؤں سے بچاؤ۔ یہ دونوں ہماری حفاظت، ہماری توپوں اور بندوقوں کے محتاج ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں [illegible] اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے ہندستان کی آزادی کا محل اڑا اڑا دھم کر کے گر پڑا ہو۔ جیسے پچھلے سو برس کی تمام قومی روایتیں ایک لمحے میں مٹی میں مل گئی ہوں۔ .. ترک موالات اور تحریک خلافت۔ سودیشی اور بائیکاٹ۔ جلیانوالا باغ کی قربانی۔ گاندھی جی اور علی برادران۔ بھگت سنگھ۔ ستیاگرہ اور سول نافرمانی .. ... تمام نعرے اور قومی گیت۔ ہندستان کا اتحاد اور ہندستان کی عزت اور آبرو .. ... آرٹ اور ادب۔ موسیقی اور شاعری اور مصوری ... ... ہر چیز مٹی میں مل گئی ہو۔

"مٹی میں مل کر بھی اس کندن کی چمک نہیں گئی "۔ گائیڈ بک رہا تھا۔

"اجنتا، ہندستان کے آرٹ اور ادب موسیقی اور شاعری اور مصوری کا لافانی شاہکار ہے "۔ بھارتی کہہ رہی تھی۔

مگر نرمل کو اس اندھیرے غار میں بجلی کی چمکیلی روشنی کے گچھے میں بھی سوائے پھیکے پھیکے رنگوں کے چند بے معنی دھبوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ نہ حسن نہ آرٹ۔ نہ معنی، نہ مقصد۔ بجائے احساس حسن کے اس کا دل ایک عمیق غصے۔ ایک بے پناہ نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ چلا اُٹھتا۔

"یہ سب کیوں؟ ... یہ ہزاروں آدمیوں کی ہزاروں برس کی محنت۔ کیوں اور کس لئے؟ ... یہ پہاڑ کی گود [illegible] ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی [illegible] کیوں؟ اور کس لئے؟ ... بیکار ہیں یہ سب۔ یہ ساری محنت بیکار تھی۔ دنیا کے لاکھوں برس کے ارتقا میں ایک [illegible] دو قدم پیچھے۔ ... [illegible] پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے۔ ... [illegible] ہندوستان نے کچھ سیکھا ہے اور نہ سیکھے گا۔ یہ غار دنیا سے، اصلیت سے، سچائی سے فرار کے لئے بنائے گئے ہیں۔ [illegible] ایک زبردست جھوٹ ہے۔ دھوکا ہے، فریب ہے ..."

گائیڈ نرمل کے خوفناک خیالات کی دنیا سے بے خبر [illegible] دکھائے جا رہا تھا۔

"یہ دیکھئے مہاتما بدھ گھوڑے پر چڑھے بازار میں سے گزر رہے ہیں ان کے چہرے پر کتنی شانتی ہے۔ ... اور دیکھئے یہ عورتیں اپنے

گھروں پر سے ان کو کتنی معتقدانہ نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں ۔۔

اور بھارتی کہہ رہی تھی۔

"نرمل دیکھو، ان عورتوں کے چہروں پر کتنی حسین وجدانیت طاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت اور ان کی ممتا کو صرف اجنتا کے آرٹسٹ ہی سمجھے ہیں ۔۔۔"

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح، ان کی شانت آتما، ان کی نزاکت، ان کی ممتا!

نرمل کا جی چاہا کہ قہقہہ مار کر اتنے زور سے ہنسے کہ غاروں کی تعمیر کی دیواریں لرز اٹھیں، یہ چٹانیں تھرا اٹھیں، یہ غاروں کا سارا علاقہ اس کے نعرۂ حقارت سے گونج اٹھے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما! ان کی نزاکت!

!!! ان کی ممتا!!!

جھوٹ۔ سراسر جھوٹ۔ دھوکا۔ خود فریبی۔

نرمل نہ کمیونسٹ تھا اور نہ کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھتا، مگر ایک دن وہ کمیونسٹ پارٹی کے دفتر میں پارٹی سیکریٹری پورن چند جوشی کا بیان لینے گیا راستہ میں ایک سڑک کی طرف سے کچھ شور کی آواز آئی اور سب لڑکوں کی طرف بھاگے۔ [illegible] دیکھا تو ایک بوڑھا [illegible] داڑھی [illegible] مسلمان [illegible] بے حالت میں سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ اور سامنے کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی کھڑکی میں نرمل کی دہلیز پر برہنہ عورتوں کا ایک گروہ

کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دلچسپ اور مزے دار تماشہ ہو رہا ہو۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!۔

ایک ریڈکراس کی موٹر آئی اور بوڑھے پوربی مسلمان کی لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ اور سامنے والے مکان میں سے ایک مرہٹہ عورت بالٹی [illegible] لٹکائے نکلی اور جہاں بوڑھے کا خون گرا تھا وہاں نہایت اطمینان سے پانی [illegible] سڑک کو دھو گئی اور کئی روز نرمل کے کانوں میں ان عورتوں کے [illegible] ایک خوفناک شور بن کر گونجتے رہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس بوڑھے کی سفید داڑھی جو خود کے خون سے رنگین ہو گئی تھی، ایک بھیانک سے گولے بن کر پھڑپھڑاتی رہی۔ اور اسے ا۔۔ معلوم ہوا کہ تمام ہندوستان کی عورتیں کسی ایسے خوفناک اور خونیں مذاق پر ہنس رہی ہیں جو اس کی سمجھ سے باہر ہے۔

ہندوستانی عورتوں کی اصلی روح! ان کی شانت آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!!

نرمل کے بہت سے دوست مسلمان تھے مگر فساد کے دنوں میں وہ ان کے محلوں میں نہیں جا سکتا تھا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی رپورٹر اور دوست حنیف کو سخت بخار اور سرسام ہو گیا ہے۔ نرمل سے نہ رہا گیا اور بھنڈی بازار پہنچ ہی گیا۔ جہاں ایک چال میں حنیف اکیلا رہتا تھا۔

کرافورڈ مارکیٹ پر سوائے نرمل کے تمام ہندو بس سے اتر گئے۔ وہ خود کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کی وضع قطع سے یہ ہرگز نہ معلوم ہوتا تھا

کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان یا عیسائی۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے بعض تو اسے پارسی ہی سمجھتے تھے مگر پھر بھی جوں جوں بس مبیئی کے "پاکستانی" علاقے میں جا رہی تھی اس کا دل خوف اور پریشانی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے برابر بیٹھا ہوا ہٹا کٹا "غنڈہ نما" مسلمان نوجوان اس کے دل کی دھڑکن سن کر سمجھ جائے گا کہ وہ ہندو ہے اور اپنی جاکٹ میں سے چھرا نکال کر اس کی کمر میں گھونپ دے گا۔ اسی طرح جیسے پیدنی روڈ پر اس دبلے پتلے نوجوان کو ایک ہندو غنڈے نے "مشٹیک" سے مار ڈالا تھا۔ اور دفعتاً نہ جانے کیوں اس کی کمر میں ریڑھ کی ہڈی کے پاس کھجلی سی محسوس ہونے لگی اور ایک خیالی چاقو کا تیز پھل اس کی پسلیوں میں پیوست ہوتا گیا۔

بائیکلی والا اسپتال کے پاس وہ بس سے اتر کر پٹری پڑی چلا تو اسے چاروں طرف قاتل ہی قاتل نظر آئے۔ وہ چھابڑی والا جو کیلے اور موسمبیاں بیچ رہا تھا نہ جانے وہ کس وقت اپنا ترکاری کاٹنے کا چاقو ایک ہندو کی کمر میں پیوست کر دے۔ وہ خوفناک لال داڑھی والا پٹھان تو ضرور ایک "کافر بچے" کی تلاش میں ہوگا۔ پشت سے پتھریلی سڑک پر کھٹ کھٹ قدم قریب آتے ہوئے سنائی دیئے۔ نرمل نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ کوئی برقعہ پوش عورت تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ دفعتاً اسے خیال آیا کہ اس برقعہ میں کوئی "غنڈہ" ہی چھپا ہوا ہو۔ اور وہ تقریباً دوڑتا ہوا حنیف کی چال کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا

حنیف سرسامی کیفیت میں بے ہوش پڑا تھا۔ نرمل کو اس کے پاس

شام تک ٹھیرنا پڑا۔ جب حنیف کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی اور اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا اسی وقت ایک سپاہی بھونپو میں پکارتا ہوا وہاں سے گزرا کہ شام کے پانچ بجے سے کئی علاقوں میں چوبیس گھنٹوں کا کرفیو لگا دیا گیا ہے کوئی گھر سے نہ نکلے کیوں کہ گشتی فوجیوں کو سر راہ چلنے والوں پر گولی چلانے کے احکامات دیدیئے گئے ہیں۔ نرمل نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے میں دس منٹ تھے اتنی دیر میں اس کا شیوا جی پارک پہنچنا ناممکن تھا۔ چار و ناچار اس نے رات حنیف کے کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

حنیف کا کمرہ کنارے پر تھا۔ ایک کھڑکی میں سے بڑی سڑک نظر آتی تھی، دوسری ایک گلی میں کھلتی تھی۔ سڑک پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنے کی فکر میں تھا۔ نرمل نے دیکھا کہ ایک پوربی دودھ والا بھیا، جس کی بھی چوٹی دور دور سے پکار کر کہتی ہے کہ "میں ہندو ہوں"، کندھے پر بہنگی جس میں دو دو دودھ کی گڑویاں رکھی ہوئی ہیں۔ سراسیمہ نظروں سے ادھر ادھر آگے پیچھے دیکھتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اور اس چوٹی والے دودھ والے واقع کی طرح نرمل کا پھر بے اختیار جی چاہا کہ چلا کر دودھ والے بھیا کو خطرے سے آگاہ کر دے۔ مگر اس بار پھر الفاظ اس کی زبان پر جم کر رہ گئے اور چشم زدن میں تین مگر تہمد بند جوانوں نے اس دبلے پتلے بھاگتے پوربی کو گھیر لیا۔

"کہاں جاتا ہے بے کافر کے بچے؟"

دودھ والے بھیا کی گھگھی بندھ گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ شاید اسے ان تینوں کی آنکھوں میں اپنی موت نظر آئی۔ وہ واپس مڑا۔ اور وہ بھی غلطی کا ایک۔

گیا دیکھا ہوا اس کی طرف تا ہا خطروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ہرن کی طرح
جو ہر طرف شکاریوں سے گھر گیا ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لئے مایوس آنکھوں سے
ادھر ادھر دیکھا اور پھر دفعتاً وہ اس گلی کی طرف بھاگا۔ وہ اس کے تعاقب میں
باہر نکل گئے تھے ------

رمل بھاگا۔ گلی والی کھڑکی کی طرف گیا۔ مگر ابھی وہ ادھر تھا۔ پتا نہ
چلا کہ وہ کدھر بھاگ گیا۔ اسی جھنجھلی میں ٹھوکر گرنے کی آواز آئی۔ جس کی گرد وہاں
ایک خوشبو سا تو شرک بھاگ رہے تھے اور ان کا دو ایک سا تھ ہی جا کر یہ
نکلا۔ جب رمل نے کھڑکی میں سے دیکھا تو اس بوڑھی کا سرخ
خون بہہ چکا تھا۔

"ہائے کر دیا مارا سالا

اور پھر سامنے برابر کے کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز
سنی۔

"ارے ادگل بانو۔ پتہ تو ہے ایک کافر ہماری گلی میں ننگا ہے"
جیسے کوئی کہہ رہی ہو۔ ارے ادگل بانو مبارک ہو ہماری گلی والوں نے
آج کتنی بہادری کا کام کیا ہے"۔ ۔۔ اور پھر سا چار ادھیڑ بوڑھی
عورتوں کی ٹولی سے بڑی خوشی آواز آئی

"ارے اس کی جان تو دیکھ

"اچھا ہوا ۔۔۔ ملا ہے بس۔ اب
سزا ملی ہے"

"گڑگام میں جو مسلمان مارے ہیں ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے"

اور پھر ان ہی میں سے کوئی عورت اندر گئی۔ اور گھر بھر کا کوڑا، ترکاری کے چھلکے، انڈوں کے خول، گوشت کے چھیچھڑے اور ہڈیاں، گلی میں اُلٹ دیا۔ عین وہاں جہاں مکھیوں نے پوربی بھیا کے دودھ اور خون پر بھن بھنانا شروع کر دیا تھا۔

ہندستانی عورتوں کی اصلی روح!! ان کی آتما!! ان کی نزاکت!!! ان کی ممتا!!!

سینڈہرسٹ روڈ والی عورتوں اور بھنڈی بازار والی عورتوں کے خونی قہقہے مل کر نرمل کے لاشعور پر ایک مہیب گونج بن کر چھائے ہوئے تھے وہی گونج اسے اب تک اجنتا کے ان غاروں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ دھندلی پھیکی رنگ کی تصویروں میں اسے ہر دیوی، ہر اپسرا، ہر پاربتی، ہر عورت کے چہرے پر ایک شیطانی خوشی اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتلانہ چمک نظر آئی۔ اور نرمل کا دل ایک عمیق نفرت سے بھر گیا۔

"میں ہر عورت سے نفرت کرتا ہوں" ۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "ہر عورت سے۔ یہاں تک کہ بھارتی سے بھی ——— بھارتی ——— جو اس سے محبت کرتی تھی اور جس سے مدت سے وہ بھی محبت کرتا تھا۔ بھارتی جو نرمل کو اور اس کی حساس طبیعت کو اپنی دولت کی بنیاد میں رکھنا چاہتی تھی۔ جو بمبئی اور اس [illegible]

محبت - نفرت - نفرت - محبت - ہم بھائی بھائی ہیں - ہم عاشق و معشوق
ہیں - ہم دوست اور ساتھی ہیں - ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے رشتے
میں منسلک ہیں، مگر ہم ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں - ہم ایک دوسرے
کی کمر میں چھرا گھونپتے ہیں - ہم ایک دوسرے پر پتھر پھینکتے ہیں - ایک دوسرے
کا خون بہاتے ہیں - ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں ... ...

"دیکھئے - یہ لاشیں دیکھئے - سر الگ اور دھڑ الگ "

گپتا اپنی رو ہی رو میں کہے جا رہا تھا - بولتے بولتے اس کو پسینہ آ گیا تھا
مگر اس کی آواز نہ تھمکی تھی ---- اور بیمار تھی - نازک، نفاست پسند، حساس
نرمل الجھی تھی ---- نرمل کی دیوار پر تصویر ہی میں لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے
کا رنگ اڑا جا رہا تھا -

"اس ظالم راجہ نے سب کو قتل کرا دیا ہے - سر کٹوا کر لاشیں اس گڈھے
میں پھنکوا دی ہیں - چیلوں گدھوں کے کھانے کے لئے ... ... "

اور نرمل کے دماغ میں یہ غیر متعلق خیال رینگتا ہوا چلا آیا کہ دراصل راجہ
ظالم نہیں تھا بلکہ شاید اسے گدھوں چیلوں کا بڑا خیال تھا - ان کو خوراک بہم پہنچانے
کے لئے اس نے ان سب لوگوں کو مروا کر ان کی لاشیں یہاں ڈلوائی تھیں - اس
کے ظلم میں کم سے کم مردار خور جانوروں کا تو بھلا تھا ... ...

لاشیں! ... ...

تمام ٹھنڈی، زخم شدہ کالی اور نیلی لاشیں، جو ٹھنڈے پتھر کے
فرش پر اس طرح بکھری ہوئی پڑی تھیں - جیسے فصل کٹنے کے وقت کسان

نے گیہوں کی بالیں کاٹ کر کھیت میں چھوڑ دی ہوں ... جیسے مذبح خانے میں ستائیس بکروں کی کھال اتار کر ایک قطار میں لگا رکھا ہو ... جیسے ... جیسے ستائیس انسانی لاشیں بکھری ہوئی ہوں!

ترمل اخبار کے لئے رپورٹ لینے اسپتال گیا تھا اور وہاں اسے پتہ چل گیا کہ کس کمرے میں فساد کے مقتولین کی لاشیں پوسٹ مارٹم اور کورونر کے فیصلے کے لئے رکھی گئی ہیں۔ اس نے عمر بھر میں صرف ایک بار ایک لاش میڈیکل کالج کے سرجری وارڈ میں رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ تب بھی تین وقت اس سے کھانا نہ کھایا گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی مردہ آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہی تھیں، مگر یہاں ایک لاش نہیں ستائیس لاشیں رکھی تھیں۔ بوڑھے۔ جوان۔ بچے۔ سوکھے ہوئے جسم۔ کسی کی کمر میں گھاؤ۔ کسی کی آنتیں پیٹ سے باہر نکلی ہوئی۔ کسی کی گردن سے سر جدا۔ دھڑ کے قریب رکھا ہوا۔ کسی کا بھجا پھٹے ہوئے سر میں سے باہر اُبلتا ہوا۔ ان میں سے کون ہندو تھا؟ اور کون مسلمان؟ موت کی برادری میں سب ایک تھے۔ قاتل کی چھری نے سب کو برابر برابر لٹا دیا تھا۔ یہ ٹھنڈا پتھریلا فرش۔ یہ تھا ان کا پاکستان اور ان کا ہندستان۔ یہ بیکار موت۔ یہ پتھرائی ہوئی آنکھیں۔ یہ سناٹا۔ یہ بیچارگی ——— یہ تھی ان کی آزادی۔ یہ تھا ان کا اسلام اور یہ تھا ان کا ویدک دھرم ——— بجے جے مہادیو ——— اللہ اکبر!

ترمل عملی سیاست سے ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ علاوہ اخبار کے کام کے جو وہ پیٹ کی خاطر کرتا تھا وہ عمل کے میدان کا جنگی نہیں تھا۔ اس کی دنیا خیالات اور محسوسات کی دنیا تھی۔ پھر بھی فسادات شروع ہونے کے تیسرے

دن ہی وہ اپنے محلے کے شانتی دل میں شامل ہوگیا تھا۔ اور شاید اس لئے کہ اس کا تعلق ایک اہم روزانہ اخبار سے تھا۔ اور شانتی دل ہو یا سیوا سماج ہو یا خدامِ وطن، ہر پبلک جماعت کو پبلسٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کو کمیٹی کا ممبر بھی چن لیا گیا تھا۔ نرمل کا دوست اور ہمسایہ احمد جو ایک دوسرے اخبار میں سب اڈیٹر تھا۔ وہ بھی کمیٹی کا ممبر چن لیا گیا تھا۔ اس لئے کہ تمام شیواجی پارک کے علاقے میں وہی صرف اکیلا مسلمان تھا جو شانتی دل میں شامل ہوا تھا اور ایسی کمیٹیاں سرکاری منظوری نہیں حاصل کر سکتیں جب تک ان میں سب فرقوں کے نمائندے موجود نہ ہوں۔

چند روز تک نرمل شانتی دل کی تنظیم کے کام میں مستغرق رہا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا کہ فساد کے اثر سے اس پر جو ایک مہلک جمود اور گھٹے گھٹے غم اور بے بسی کی حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ اب جاتی رہے گی۔ شانتی دل میں شامل ہو کر اس کو وہی وجد آفریں مسرت حاصل ہوئی جو ایک سپاہی کو طبل جنگ سن کر ہوتی ہے یہ جنگ تاریکی اور روشنی کے درمیان تھی۔ غارت گری اور امن کے درمیان۔ وہ اس جنگ میں ایک سپاہی تھا۔ وہ شیطانی تعصبات اور درندگی کے خلاف جہاد میں شریک تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس جنگ میں کوئی کارہائے نمایاں نہ کر سکے مگر کم سے کم اس کو یہ تسلی تو تھی کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ کہ اس کی زندگی بالکل بیکار، بے معنی، اور بے مقصد تو نہیں ہو گئی ہے۔

بھارتی نے کئی بار نرمل سے کہا

"چلو بمبئی سے باہر کہیں چلے چلیں۔ جب فساد ختم ہو جائے گا۔ تب آ

جائیں گے ۔"

آگرہ، دہلی، کشمیر، اجنتا، ایلورہ، میسور، سیلون نہ جانے کہاں کہاں جانے کا لالچ دلایا، مگر نرمل کو ایسے وقت بمبئی چھوڑ کر باہر جانا پرلے درجے کی کم ہمتی اور بزدلی معلوم ہوئی۔ بھارتی نے لاکھ سمجھایا کہ اس جیسے حساس آرٹسٹ کے لئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا، اس کی خداداد ذہانت کی تحقیر تھی۔ مگر وہ نہ مانا۔ اور سوائے دفتر کے اوقات کے سارے دن اور رات کا بیشتر حصہ شانتی دل کے کام میں صرف کرتا رہا۔

شانتی دل کا کام؟ نرمل سمجھتا تھا کہ اس کا کام واقعی شانتی کا پرچار ہوگا اس کا خیال تھا کہ شانتی دل کے ممبر گھر گھر جائیں گے اور لوگوں کو امن اور شانتی سے رہنے کی تلقین کریں گے، آپس کی فرقہ وارانہ منافرت کو دور کر کے یگانگت اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ شہر میں خود ان کے علاقے میں ہر دم ہر قسم کی افواہیں مشہور ہو رہی تھیں۔ ماہم کے مسلمان شیواجی پارک کے ہندوؤں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شیواجی پارک کے ہندو ماہم کے مسلمانوں پر حملہ کرنے والے ہیں، ہندو دودھ والے دودھ میں زہر ملا کر مسلمانوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں، مسلمان ترکاری والے بینگنوں اور مولیوں میں زہر کے انجکشن دے کر ہندوؤں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں۔ ایرانی ہوٹلوں کی چائے مت پیو، اس میں زہر ہے۔ ہندو حلوائی کی مٹھائی مت کھاؤ، اس میں زہر ہے! ——جھوٹ جھوٹ جھوٹ، جھوٹ، اور تعصب اور نفرت کا ایک طوفان جس میں تمام شہر ڈوبا جا رہا تھا۔ نرمل اور اس کے دوست احمد کو امید تھی کہ شانتی دل کا پہلا کام ہوگا اس

خونی سیلاب کو روکنا۔ مگر جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

شانتی دل کا پہلا کام۔ چندہ جمع کرنا ..... احمد کے ساتھ تو ہر کسی کے ہاں گیا۔ گنتی کے جو چند مسلمان تھے انھوں نے مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

"یہ شانتی دل کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں .. ... ہم نے بھی اپنی حفاظت کے لئے پٹھان رکھ لئے ہیں ..."

بعض ہندوؤں نے کہا

"آپ کے سہتے والنٹیر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں ؟ ۔ ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں ۔ " اور پھر رازدارانہ لہجے میں ۔ "سکھ کرپان رکھ سکتے ہیں، کیا سمجھے "

خیر چندہ جمع کیا گیا۔ بیس پہرے دار پچاس پچاس روپے ماہوار پر ملازم رکھے گئے۔ پھر یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ ان کو کہاں کہاں ڈیوٹی پر لگایا جائے۔

"ایک ایک آدمی ہر ایک کے ناکے پر لگایا جائے"۔

"نہیں ۔ یہ حماقت ہو گی ۔ حملہ تو تین طرف سے ہو سکتا ہے، یا ماہم کی طرف سے یا ورلی کی طرف سے یا سمندر کی طرف سے، صرف ان ناکوں پر پہرہ لگانا چاہیے ۔ ۔

"حملہ ؟ ۔ کس کا حملہ .."

"مسلمان اگر حملہ کریں گے تو ادھر سے حملہ کریں گے نا ؟"

"پرانے پہرے داروں کا کام کیا ہو گا ؟ "

"ان سے کہہ دیا جائے کہ جیسے ہی کسی مسلمان غنڈے کو دیکھیں سیٹی بجا دیں
تاکہ چاروں طرف سے لوگ جمع ہو جائیں"

"صرف مسلمان غنڈے؟ اور اگر ہندو غنڈے ہوں تو؟"

نرمل نے یہ سوال کیا تو، مگر وہ احمد سے آنکھیں چار نہ کر سکا۔

کمیٹی کے جلسے کے بعد اس نے احمد سے کہا۔

"یہ تمہاری ہی ہمت ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کام کر سکتے ہو۔ مجھے
تو یہ سب مہا سبھائی معلوم ہوتے ہیں"

احمد نے کہا۔

"ایسے بیوقوفوں اور جاہلوں کی کمی دونوں طرف نہیں ہے۔ تم نہیں
جانتے کہ ماہم کے مسلمانوں میں کیا کیا افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیوا
جی پارک میں شانتی دل کے نام سے ہندوؤں کی ایک فوج تیار کی جا رہی ہے جو
بہت جلد ماہم کے مسلمانوں پر شب خون مارے گی"

چندہ - والنٹیر - محافظ - وردیاں - سیٹیاں - جلسے - رزولیوشن - پولس
کمشنر کے نام عرضیاں - مگر شانتی کا پرچار؟ اتحاد کا پروپگنڈا؟ ان کا نام نہیں۔ تو
پھر شانتی دل کا مقصد؟ اس دوڑ دھوپ سے فائدہ؟ مسلمان غنڈے ـــــ
ہندو غنڈے ـــ گھروں میں پتھر جمع کر کے رکھو، میں نے تو دس لاٹھیاں
چھپا رکھی ہیں۔ میرے ہمسائے کے پاس پستول ہے"۔ شانتی! شانتی!!
شانتی!!!

"یہ شانتی کا مہا ساگر ہے نرمل"۔ بھارتی کہہ رہی تھی۔ "اگر ہم آٹھ

دس دن تک روز یہاں آکر کئی گھنٹے گزارا کریں تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے بے چین
دل کو ضرور شانتی ملے گی "

اور گائیڈ کہہ رہا تھا۔

"آپ نے سب غار دیکھ لئے ہیں۔ اب ایک باقی رہ گیا ہے۔ مگر اس میں
آپ کو دوسرے غاروں کی طرح سنگتراشی اور مصوری کے نادر اور حسین نمونے
نہیں ملیں گے۔ چھت، ستون، فرش، ہر چیز نامکمل ہے۔ اس غار کا کام ادھورا
رہ گیا ہے ۔ ... "

"ادھورا کام!" وہ ___ نرمل ___ بھی تو بمبئی میں اپنے کام کو ادھورا چھوڑ
کر چلا آیا تھا۔ بلکہ ادھورے سے بھی کم ___ ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی
کہ اس نے ہار مان لی تھی۔

شانتی دل کمیٹی کا آخری جلسہ۔

نرمل نے شروع ہی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بجائے معمولی اَن پڑھ اور
اجڈ دہاتوں اور چوکیداروں کے آزاد ہند فوج کے سابق سپاہیوں کو معقول مشاہرے
پر حفاظت کے لئے رکھا جائے کیونکہ وہ فرقہ وارانہ تعصبات سے پاک اور بالا تھے
ان میں قومی خدمت کا جذبہ تھا اور وہ اپنی پرانی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے
مدد کے مستحق تھے۔ شانتی دل کے سیکریٹری نے اس جلسے میں بیان کیا کہ پرانے
تمام پہریدار علیحدہ کر دیئے گئے ہیں اور ان کی بجائے چودہ آزاد ہند فوج کے
سابق سپاہی رکھ لئے گئے ہیں۔ یہ سن کر نرمل کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا
کہ اب شانتی دل کا کام صحیح طریقے پر ہوگا۔ مگر ایک لمحے ہی میں اس کی امیدوں

پر پانی پھر گیا۔

ایک بوڑھے مرہٹہ وکیل نے سوال کیا

"کیا یہ سچ ہے کہ آزاد ہند فوج کے ان سپاہیوں میں مسلمان نہیں

ہیں؟"

سیکریٹری نے کہا۔

"ہاں، مگر صرف ایک"

ایک موٹے گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"میرے حلقے میں اس بات پر بڑی بے چینی پھیلی ہوئی ہے"

ایک دبلے سوکھے مارواڑی نے کہا۔

"یہ تو عجب کی بات ہے"

بوڑھے وکیل نے اونچی آواز میں کہا۔

"میں سیکریٹری صاحب سے اس معاملہ میں جواب طلب کرتا ہوں

کہ کیوں ایک مسلمان کو رکھا گیا"

گجراتی سیٹھ نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"اگر ایسا ہو گا تو ہم لوگ ایک پیسہ چندہ نہیں دیں گے"

ایک پستہ قد ڈاکٹر نے کہا۔

"میرے حلقے کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر مسلمان . . "

دبلے سوکھے مارواڑی نے کہا

"یہ ہماری استریوں کی عزت کا سوال ہے"

بوڑھے وکیل نے کہا۔

"میں جواب طلب کرتا ہوں ... ..."

پریسیڈنٹ نے کہا۔

"خاموش۔ خاموش"

سکریٹری نے کہا

"جب تو اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ آزاد ہند فوج میں ہندو مسلمان کی تفریق نہیں کی جاتی۔ پھر اگر کمیٹی کی رائے ہے کہ سب ہندو سپاہیوں سے مسلمان سپاہی کو علیحدہ کر سکتے ہیں"

سب نے بیک وقت شور مچایا۔

"ہاں ہاں"۔ "فوراً" "ایک دم"۔ "اس کو ابھی کیجئے"۔ صرف احمد خاموش بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں احمد کو اچانک سے مسکراتے دیکھ کر ... کی چہرہ دفعتاً لیریز ہو گیا۔ اس کے دماغ کے اندر کی کوئی کل دفعتاً ... گئی۔

"نہیں۔ نہیں!" وہ غیر معمولی جوش سے چلایا۔ سکریٹری جو جلسے کی روئداد میں یہ الفاظ لکھنے میں مصروف تھا کہ "یہ تجویز ... آزاد ہند فوج کے جن سابق سپاہیوں کو حفاظت کے لئے ... ان میں کوئی مسلمان نہ ہو" ... اپنی کرسی سے تقریباً اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ سے قلم گر پڑا اور سفید کاغذ پر جہاں اس تجویز کے الفاظ لکھے گئے تھے، ... روشنائی کا ایک بڑا دھبہ پڑ گیا ... ..."

"نہیں! نہیں!! نہیں!!! جیسے اس ایک لفظ کو دس بار دہرانے سے باقی دس ممبروں کی رائے منسوخ ہو جائے گی، میں ایسی تجویز کی کبھی کسی حالت میں بھی موافقت نہیں کر سکتا"

نرمل کے الفاظ کی والہانہ شدت نے چند لمحوں کے لئے سب کو خاموش کر دیا۔ مگر اس خاموشی میں اسے اپنی آواز کھوکھلی اور بے معنی معلوم ہوئی۔ "ایسی تجویز ہمارے لئے باعث شرم ہوگی۔ ہم شانتی اور اتحاد کے نام لیوا ہیں۔ مگر ہم خود بد ترین فرقہ وارانہ تعصب کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اگر یہ تجویز پاس ہوئی تو میں اس معاملہ کو پریس اور پبلک کے سامنے رکھنا اپنا فرض سمجھوں گا"

اور احمد مسکرائے جا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"شاباش، بچے۔ مگر یہ سب بے کار ہے"

ڈبلے مارواڑی نے مخالف اول کی حیثیت سے کہنا شروع کیا۔

"مسٹر نرمل کو نہیں معلوم کہ ہم ہندو کتنے کٹر ہیں . . ."

گجراتی سیٹھ نے کہا۔

"ہم تو صاف بولیں گے۔ اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے"

پستہ قد سیٹھ نے کہا۔

"ہم استعفیٰ دے کر ہندو مہا سبھا کے سودیشی دل میں مل جائیں گے"

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے دوسروں کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش کرتے ہوئے نرمل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر نرمل ایک بات بتائیے۔ یہ ہندو علاقہ ہے۔ اگر یہاں پہرہ دینے

ہوئے اس بیچارے مسلمان سپاہی کو کچھ ایسا ویسا ہوگیا تو کون ذمہ دار ہوگا ؟ آپ"
اور یہ کہہ کر اس نے گجراتی سیٹھ اور پستہ قد ڈاکٹر کی طرف دیکھا [illegible] ہم سہا
ہو کہ دیکھا میرا ذاتی تجربہ ہے - ایسے ایسے لونڈے میں نے بہت دیکھے ہیں ... "

احمد نے مسکرا کر نرمل کی طرف دیکھا اور نظروں میں کہا۔

"میں نے کہا تھا نہیں کہ کوئی فائدہ نہیں ہے .. "

تجویز پاس ہو گئی - نرمل بپھرا ہوا خاموش بیٹھا رہا - وہ بہت کچھ کہہ سکتا تھا - دعوے دلائل - منطق - سیاست - مگر اسے معلوم تھا کہ اس تعصب [illegible] کی دیوار پر سر ٹکرانا لا حاصل ہے۔ اس کے چاروں طرف آوازوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا۔ تجویزیں پاس ہوتی رہیں۔ بحث مباحثے ہوتے رہے۔ حسب معمول مختلف ممبروں اور عہدے داروں میں سخت کلامی بھی ہوتی رہی۔ مگر نرمل نے نہ کچھ کہا نہ سنا۔

اس کا دماغ خوفناک خیالات اور مناظر کا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ کلکتہ - بمبئی - احمد آباد - نواکھالی - بہار - قتل - خون - خون کی ندیاں - خون کے دریا - خون کی [illegible] نفرت اور تشدد - تعصب اور نفرت - عورتوں کی بے حرمتی - بچوں کی لاشیں - انسانوں کے پہاڑ - ایک خونیں آسمان کی طرف لپکتے ہوئے ہزاروں شعلے . اور یہ کلدار ہتھوڑے کی طرح یہ خیال اس کے دماغ پر چوٹ لگا رہا کہ یہ سب [illegible] رہا ہے کہ شیواجی پارک شانتی دل کے ممبر آزاد ہند فوج کے ایک مسلمان سپاہی کو اپنی حفاظت کے لئے رکھنے کو تیار نہیں ہیں .

اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ آزاد ہند فوج کے شاندار تاریخی کارنامے بیکار

تھے ۔ تمام جنگ آزادی بے کار تھی ۔ تمام دیش بھگتوں اور شہیدانِ وطن کی قربانیاں بیکار تھیں ۔ تمام قومی نعرے ۔ تمام قومی تحریکیں، تمام قومی لیڈر، ہر شخص بیکار تھا۔ ہر چیز بے کار تھی ۔ شیواجی پارک شانتی دَل بیکار تھا۔ اس سلسلے میں اَنل کا کام بے کار تھا۔ اس کا بمبئی میں رہنا بے کار تھا۔ اس کی زندگی ہی بیکار تھی ۔ ۔ اس لئے کہ ہندو اور مسلمان کے ٹھپے آزادی اور ہندوستان سے زیادہ اہم ثابت ہوئے تھے۔

اُسے شانتی دل کمیٹی کے وہ سب ممبر اس وقت تعصب اور نفرت اور خطرناک جہالت کے دیوتا معلوم ہوئے جو اپنی آتشیں آنکھوں سے اس کو گھور رہے تھے ۔ جو اسے بھسم کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھے آ رہے تھے ۔ وہی دس نہیں، بلکہ ہر طرف سے لاکھوں راکششوں کے دَل کے دَل اس کی طرف بڑھے آ رہے تھے ۔ ان میں چوٹی والے بھی تھے اور داڑھی والے بھی ۔ ہندو بھی اور مسلمان بھی، بنگالی بہاری، مرہٹہ، گجراتی، پنجابی، پوربی، پٹھان اور سب اس کے خون کے پیاسے

" بھاگ "

انل کے دھڑکتے ہوئے دل نے اسے للکارا

" بھاگ "

اور انل نہ صرف جلسے کے ختم ہونے سے پہلے ہی شانتی دل کے دفتر سے بھاگا بلکہ اگلے دن بھارتی کے ساتھ بمبئی سے بھی بھاگ آیا۔

" کہاں چلیں ؟ " بھارتی نے پوچھا

" جہاں یہ قتل و خون نہ ہو، جہاں [illegible] نہ ہو، [illegible] نہ ہو، جہاں [illegible] نہ ہوں

مسلمان نہ ہوں، جہاں چاقو، چھریاں، برچھے، بھالے، تیزاب اغنڈے سے

موالی نہ ہوں ... ... دور ... دنیا اور زندگی سے دور ——— ۔"

اور بھارتی نے سوچ کر کہا۔

"اچھنتا؟"

احمد نرمل کو چھوڑنے اسٹیشن پر آیا گاڑی چلنے لگی تو اس نے کہا۔

"اچھا ہے چند روز کے لئے تبدیلی آب و ہوا کر آؤ۔ مگر اگلے اتوار کو شانتی

دل کا جلسہ ہے جس میں چند تجویزیں پیش کرنے والا ہوں اس میں تمہاری موجودگی

ضروری ہے۔

اور جب نرمل نے کہا۔

"میں اب شانتی دل کے جلسے میں کبھی نہ جاؤں گا۔"

تو احمد نے چلتی ریل کے ساتھ بھاگتے ہوئے کہا تھا۔

"تم اس کام کو ادھورا چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے نرمل۔"

"ادھورا کام ......"

جسے یہ اجنتا کے مصور [illegible] ادھورا [illegible] آج تک

ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے [illegible] تک

درجنوں نسلوں کی مسلسل [illegible] کے لئے [illegible]

"تمہارا کیا خیال ہے، بھارتی ..."

پر بھارتی وہاں نہیں تھی [illegible] تھی اس کی آواز غار کی

پتھریلی دیواروں سے ٹکرا کر [illegible] واپس لوٹ آئی۔

شاید وہ اس اندھیرے، ادھورے غار کے کسی کونے میں اپنے خیالات میں گم ہو گیا تھا، اور بھارتی اور گائیڈ یہ سمجھ کر باہر چلے گئے تھے کہ ممکن ہے وہ تنگ آکر واپس چلا گیا ہو۔

اس کو اس غار میں گھومتے کافی عرصہ ہو گیا ہو گا کیونکہ دروازے کے باہر جو سامنے والی سرسبز پہاڑی نظر آتی تھی وہ کالی پڑ چکی تھی، شاید آفتاب غروب ہو چکا تھا ... ... ایک بڑھتی ہوئی تھکن کی طرح غار میں اندھیرا چھایا جا رہا تھا۔

نرمل باہر جانے کے لئے قدم بڑھا ہی رہا تھا کہ اس نے ایک مشعل کو اپنی طرف آتے دیکھا اور وہ یہ دیکھ کر متحیر رہ گیا کہ جو کوئی بھی یہ مشعل لئے آ رہا تھا وہ غار کے تنہا دروازے سے داخل نہیں ہوا تھا بلکہ مخالف سمت سے آ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ شاید گائیڈ اسے ڈھونڈتے ہوئے غار کے کسی دوسرے اندھیرے کونے میں چلا گیا ہو، اور اب لوٹ رہا ہو۔

مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مشعل ہاتھ میں لئے ہوئے جو آدمی گیروے رنگ کی کفنی پہنے ہوئے آیا تھا اس کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ اس نے ایک ادھورے ستون کے سہارے مشعل لگا دی اور اپنی کفنی کے کسی تھیلے میں سے ایک چھینی اور ایک ہتھوڑا نکال کر پتھر کو چھیلنے لگا۔

نرمل اس کی طرف بڑھنے والا ہی تھا کہ اس نے دیکھا کہ ویسی ہی گیروے رنگ کی کفنیاں پہنے، منڈے ہوئے سر کے درجنوں بھکشو مشعلیں لئے غار کے اندھیرے عقب میں سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

ان میں سے کسی نے بھی نرمل کی طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنی اپنی چھینیاں

اور ہتوڑے نکال کر چھت اور دیواریں چھیلنے اور ستونوں کو گول بنانے میں مصروف ہوئے۔ چند دیوار پر مٹی کا لیپ کر کے اس کی سطح ہموار بنا رہے تھے تاکہ جب دیوار اکھڑ جائے تو مصور اپنی تصویروں کے رنگین نقوش بنا سکیں۔ اور غار پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چنانچہ تونرمل اس پر حیرت سے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا پھر اس سے رہا نہ گیا۔ اور وہ اس ننگ سر اش بھکشو کے پاس گیا جو سب سے پہلے غار میں داخل ہوا تھا۔

"معاف کیجئے، میں آپ کے کام میں مخل ہو رہا ہوں، مگر مجھے آپ لوگوں کو مصروف دیکھ کر بڑا تعجب ہو رہا ہے"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اس غار کی تعمیر ادھوری ہی ہے، اور یہ ادھوری ہی رہے گی.."

"دنیا کی تعمیر بھی ادھوری ہے، انسان بھی ادھورا ہے۔ مگر ان کی تکمیل ہونی ہی چاہئیے"

اس جواب کو نرمل کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا۔ پھر اس نے پوچھا

"آپ کب سے کام کر رہے ہیں؟"

"نو سو برس سے"

"نو سو برس؟ آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی عمر . . ."

"میں اور مجھ سے پہلے میرا باپ اور اس سے پہلے . . ."

سے پہلے اس کا باپ۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور اس کے بعد تیسری نسل۔ آتما کے چکر کی طرح کام کا چکر تو چلتا ہی رہتا ہے"

"آپ کا نام؟" نرمل نے بات چیت کو ذاتی رنگ دینے کی کوشش کی۔

"میرا نام؟ کچھ نہیں۔ ہم سب بے نام ہیں"

اور نرمل کو یاد آیا کہ اس نے ان تمام غاروں میں کسی سنگ تراش یا کسی مصور کا نام کھدا ہوا یا لکھا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"پھر آپ کس لئے اتنا کام کرتے ہیں؟"

"کام کسی غرض سے نہیں کیا جاتا۔ انسان کام سے اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتا ہے"

"تو یہ کام کب ختم ہوگا؟"

"کس چیز کا؟ ... ؟"

"اس غار کو ... ..."

"پورا ہونے میں دو سو برس لگیں گے۔ اس کے بعد دوسرا، اور اس کے بعد تیسرا ... ..."

"تو کیا اجنتا کی تکمیل کبھی نہ ہوگی؟"

"ہوگی ــــ جب انسان کی تکمیل ہوگی"

نرمل کی شک پرستی اس کی حیرت پر غالب آئی، اور اس نے کسی قدر تلخی سے پوچھا

"مہربانی کر کے مجھے سمجھائیے کہ ہزاروں برس سے جو آپ جیسے ہزاروں آدمی اتنی محنت کر رہے ہیں یہ کیوں اور کس لئے؟ یہ پہاڑ کی گود سے نکلتے ہوئے غار، یہ مجسمے، یہ تصویریں، یہ صناعی، یہ مصوری؟ یہ کیوں اور کس لئے؟

اس کی آواز میں تلخی کے بجائے جوش اور غصہ آ گیا۔

"بہتر ہوتا کہ اتنی محنت پتھروں میں گلکاری کرنے کے بجائے انسانوں کو انسان بنانے میں صرف کی جاتی تاکہ آج وہ ایک دوسرے کا خون نہ کرتے ہوتے آپ لوگوں نے سنگتراشی اور مصوری کے یہ جادو گھر ہمیں دھوکا دینے کے لئے بنائے ہیں، یہ غار دنیا سے، اصلیت سے، سچائی سے فرار سکھانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

سنگتراش بھکشو کے چہرے پر ایک عجیب پرسکون مسکراہٹ تھی۔ جس میں تلخی کا شائبہ بھی نہ تھا، صرف محبت اور رحم اور عمیق ادراک۔ اس نے اپنے کام سے نظر ہٹائے بغیر سر ہلا کر نرمی سے کہا۔

"نہیں۔"

نرمل کو اس آدمی کی مسکراہٹ، اس کے صبر اور سکون پر غصہ آ رہا تھا اس نے چلا کر کہا۔

"تو پھر اجنتا کا کیا مقصد ہے؟ اجنتا کا کیا پیغام ہے؟"

"سنو" — اور صرف اتنا کہہ کر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ غار میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف پتھر پر لوہا پٹنے کی آواز۔

نرمل منتظر رہا کہ بھکشو اس کو اجنتا کا فلسفہ، اجنتا کا پیغام سنائے گا، مگر

اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ صرف اس کی چھینی کی کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور پتھر کے پتلے پتلے پتر چھل کر فرش پر گرتے رہے۔

"تو کیا تم نہیں بتاؤ گے کہ اجنتا کا پیغام ... ... ؟" مگر دفعتاً نرمل کے

اندھیرے دماغ میں سمجھ کی ایک کرن چمکی، اور اس کی زبان پر جملہ ادھورا رہ گیا

غار میں مکمل خاموشی تھی، صرف پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔

یہی تھا اجنتا کا پیغام جسے وہ بھکشو نرمل کو سنانا چاہتا تھا۔

نرمل کی آنکھوں میں سمجھ کی نئی چمک دیکھ کر وہ راہب اپنی معصوم ادا سے

مسکرا دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اور نرمل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے

دفعتاً دنیا کا سب سے بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آبِ حیات۔ اکسیر۔ اس قیمتی نسخے کے

سامنے ہر چیز ہیچ تھی۔ اُسے اجنتا کا پیغام مل گیا تھا۔

نہ جانے کب تک وہ اس غار کے کونے میں بیٹھا ہوا پتھر پر لوہے کی چوٹ

پڑنے کی آوازوں کو سنتا رہا۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

اور ہر بار جب لوہے کی چھینی پتھر کی دیوار پر پڑتی تھی، نرمل کو معلوم

ہوتا کہ وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے۔

عمل! عمل! عمل!!! کام! کام!! کام!!! محنت! محنت!! محنت!!!

عمل سے پتھر موم کی طرح پھیلایا جاتا ہے۔ عمل سے پہاڑ کی چٹانیں کاٹی

جاتی ہیں۔ عمل سے پتھر میں گلکاری کی جاتی ہے۔ عمل سے تصویروں میں زندگی

کا رنگ بھرا جاتا ہے۔ عمل سے انسان انسان بنتا ہے۔ عمل ہی عبادت ہے۔

عمل خود عمل کا انعام ہے ... .

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل، سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، یہ پتھر ضرور چھل کر، ترش کر سنگ تراشی اور مصوری کے نادر نمونے بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں، ہزاروں مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گا۔ یہ کام کبھی ختم نہیں ہوگا اس کی منزل کمالِ فن ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ آج نہیں تو کل سو برس میں نہیں تو ہزار برس میں، انسان کی فطرت کے پتھر چھل کر، ترش کر حسن اور خوبصورتی، فن اور علم کے نادر نمونے ضرور بنیں گے۔ ایک دو کے ہاتھوں نہیں۔ ہزاروں لاکھوں، کروڑوں، تمام انسان مل کر ان کو تراشیں گے۔ نسلوں کے بعد نسلیں اس کام کو جاری رکھیں گی۔ اس کی منزل تکمیل انسانیت ہے۔

کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ

پتھر پر لوہے کی چوٹ پڑنے کی آواز۔ سرل نے دیکھا کہ راہب اپنے کام میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہتھوڑے کی چوٹ اس کے انگوٹھے پر پڑی۔ زخم سے لال لال لہو کی بوندیں ٹپک کر پتھریلی فرش پر گر رہی تھیں۔

اور دفعتاً سرل کو وہ تمام تصویریں یاد آگئیں جو اس نے ان تمام غاروں میں دیکھی تھیں۔ ہزاروں برس کے بعد بھی کتنے تازہ، کتنے شاداب تھے ان

کے رنگ۔ اور نہ جانے کیوں نرمل نے سوچا۔ کہ ان تصویروں کی لالی میں انسان کے خون کا رنگ ہے۔ جبھی تو وہ اتنی جیتی جاگتی ہیں۔ جبھی ان میں اتنی زندگی ہے . . . . .

شاید وہ سو گیا۔ شاید وہ اپنے خیالات میں کھو گیا۔

جب اس کو ہوش آیا، تو غار طلوع آفتاب کی دھیمی دھیمی تیز چھی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ نہ وہ سنگ تراش تھے نہ مصور۔ نہ مشعلیں۔

تو کیا اس نے خواب دیکھا تھا؟ . . شاید . . . . کتنا عجیب خواب!

اس نے سوچا

"ہاں۔ خواب ہی ہوگا۔ رات بھر اس ماحول میں گزار کر کوئی تعجب نہیں کہ میرے تخیل نے ایک کیفیت پیدا کر دی ہو"

مگر باہر جاتے وقت جب وہ اس ستون کے قریب سے گزرا جس کو اس کے خواب والا راہب تراش رہا تھا، تو اس نے دیکھا کہ ستون پر ایک پھول کھدا ہوا ہے جو کل نہیں تھا یا شاید یہ بھی اس کا واہمہ ہی ہو۔

پھر کچھ یاد آ کر اس کی نظریں فرش پر گئیں۔ وہاں سرخ موتیوں کی طرح تازہ خون کی کئی بوندیں پتھر پر بکھری ہوئی تھیں۔

نرمل بھارتی سے ملے بغیر اسٹیشن پہنچ گیا۔ اگلے دن اتوار تھا، اور اُسے شانتی دل کے جلسے میں احمد کی تجویزوں کی حمایت کرنے کے لئے

بھیجنا ضــــروری تھا۔ بمبئی سے، فساد سے، زندگی سے، کوئی قرار نہیں
نہیں تھــا۔

ریل میں ایک ہم سفر نے پوچھا۔

"آپ شاید اجنتا ہو کر آ رہے ہیں؟"

اور نرمل نے جواب دیا۔

"جی نہیں۔ میں اجنتا کی طرف جا رہا ہوں!"

اندھیرا اور اُجالا

پرتھوی راج کپور کے نام

پہلا ریل

(جس میں آپ ہیرو سے متعارف ہوتے ہیں)

کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔

"بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ۔"

"لائٹس آن۔ لائٹس آؤٹ"

"نمبر چوبیس"

"نمبر سترہ"

"مس شکنتلا کو ایک بے بی اوور دو"

"چودہ نمبر اوپر لو"

"ستائیس نمبر کو ہارڈ کرو"

"ہارڈ اور ہارڈ۔ بس بس۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ۔ بس!"

"نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو۔ ہمیں نہیں سنبشے کا

ڈفیوزر"

"ریہرسل"

"کیمرہ ریڈی فور ریہرسل؟"

"یس ریڈی۔ او کے"

"آل لائٹس"

اندھیرے کے سمندر میں سے روشنیاں بیک وقت ایک ابھر آئیں اور رات کا دن بن گیا۔ نہ صرف سیٹ کی تین دیواریں (بغیر چھت کے) بلکہ اسٹوڈیو کا کونا کونا جگمگا اٹھا۔

"ریہرسل!"

ساؤنڈ ٹرک کی سیٹی" خاموش! خاموش!!"

ڈائرکٹر کی آواز۔ "بس ہم شکنتلا؟ ریڈی دیپ کمار؟"

"تو تم سچ مچ مجھے جیون ساتھی بنانے کے لئے تیار ہو، رادھا؟"

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے سمندر؟"

"ہاں رادھا۔ میں جیون کے جس رستے پر چل رہا ہوں وہ بڑا کٹھن اور بھیانک ہے۔ اس خاردار زندگی میں قدم قدم پر کانٹے ہیں۔ کیا اس رستے پر تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟"

"ہاں سمندر۔ تمہارے ساتھ چلوں گی تو راستے کے کانٹے بھی پھول بن جائیں گے"

"رادھا!"

بسنت رہا"

"ہاؤ از دیٹ؟"

ساؤنڈ ٹرک سے دو سیٹیاں،

"او کے۔ لائٹس آف"

"او کے۔ لائٹس آف"

"او کے۔ ریڈی فار ٹیک"

"میک اپ"

"مس شکنتلا کی لپ سٹک ٹھیک کرو"

"دیپ کمار کی ناک چمک رہی ہے"

"ریڈی فار ٹیک"

"او۔ کے"

"فوکس"

"پانچ فٹ ساڑھے گیارہ انچ"

"لیٹر ریڈ بلو۔ سیونٹی فائو لگاؤ"

"ساؤنڈ ریڈی؟"

"خاموش، خاموش، وی آر شوٹنگ"

"آل لائٹس!" ... ...

بتی جلاؤ۔

بتی بجھاؤ۔

سٹوڈیو کے فرش سے چالیس فٹ کی اونچائی پر لوہے کے گاڈروں
کے ایک کھانچے میں ایک فٹ بھر چوڑے لکڑی کے تختے کے سہارے لٹکا
ہوا، ایک ہاتھ سے من بھر وزنی لائٹ کو سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے
رسی کو مضبوطی سے پکڑے، کندن کمار سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی قسمت میں کبھی
دیپ کمار کی طرح تین ہزار روپے ماہوار پانے والا ہیرو بننا نہ ہوگا۔ کیا اس
کے سہانے سپنے "ادھورے خواب" بن کر ہی رہ جائیں گے؟ (اسے فلمی
زبان میں نہ صرف بولنے بلکہ سوچنے کی بھی عادت پڑ گئی تھی) کیا وہ ہمیشہ بائیس
روپے ماہوار پر لائٹ قلی کا کام ہی کرتا رہے گا؟ —

کندن کمار!

یہ اس کا پیدائشی نام نہیں تھا۔ اس کے باپ نے تو نگر والے جوتشی
جی کی صلاح سے اس کا نام سورج مل رکھا تھا۔ کیونکہ زائچے کے بموجب اس
کی پیدائش کے وقت سورج برج حمل سے نکل کر برج سرطان میں داخل
ہو رہا تھا۔

کندن کمار!

یہ نام تو اپنے لئے اس نے خود تجویز کیا تھا۔ ایسے ہی نہیں، سوچ بچار
کے بعد ہندوستان کے دو مشہور ترین فلمی ستاروں یعنی کندن لال سہگل اور
اشوک کمار کے ناموں کا مرکب کہ شاید اس نام کی برکت ہی سے اس کی قسمت
چمک اٹھے۔

کتنے سال سے ہیرو بننے کی خواہش اس کے سینے میں سلگ رہی تھی

وہ چھ یا شاید سات سال کا تھا اور پاٹھ شالا میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس کے
قصبے کرنال میں پہلی بار ایک "ٹورنگ سنیما" آیا۔ اب تو اسے فلم کا نام بھی
یاد تھا۔ ایڈی پولو کا کوئی "مار دھاڑ، تک بازی اور سنسنی خیز واقعات سے لبریز
فلم" تھا۔ ہالی وڈ سے چل کر نہ جانے کہاں کہاں ہوتا ہوا شاید دس بارہ برس
میں کرنال پہنچا تھا۔ "ٹاکی" ایجاد ہو چکے تھے مگر یہ فلم خاموش ہی تھا۔ اور کیونکہ
سب ٹائٹل انگریزی میں لکھے ہوئے تھے اس لئے ایک چرب زبان
آدمی ساتھ ساتھ سمجھاتا جاتا تھا۔ بہ آواز بلند۔ " دیکھو۔ دیکھو۔ سفید گھوڑے پر
سوار یہ ایڈی پولو چلا آ رہا ہے ... ... اب یہ اکیلا ان سب ڈاکوؤں کا مقابلہ
کرے گا ... ... شاباش۔ بہادر۔ شاباش۔ ہا ... سالے کو۔ ایک اور
دے ... ... وہ مارا ... " اور جب پردے پر اک بھولے بھولے گالوں
والی میم کا بڑا سا چہرہ نظر آیا اس وقت اس نے جوش میں آ کر کہنا شروع کیا،
" دیکھو دیکھو۔ کیا مزے دار لونڈیا ہے۔ بتاشہ ہے بتاشہ "۔ اس وقت کیدار ناتھ
بلکہ کہنا چاہئے سورج مل، کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ کوئی لونڈیا "بتاشہ"
کیسے ہو سکتی ہے۔ اور مزے دار تو کوئی کھانے کی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ جیسے
کلو حلوائی کی بنائی ہوئی گلاب جامن یا قلفی والے کے ہنڈے میں سے نکلی
ہوئی ملائی کی برف، یا نواب صاحب کے باغ میں سے چرائے ہوئے کھٹ
میٹھے چوسنے کے آم۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایڈی پولو اس لڑکی کے ڈبل روٹی
جیسے بھولے گالوں کو چوم رہا ہے اور شاید اسے بھی یہ لڑکی "مزے دار" ہی
لگی ہوگی کہ فوراً ہی اس نے اس کے ہونٹوں کو چوسنا شروع کر دیا ... ...

فلم، کسی خاص کمپنی کا فلم، کسی خاص سٹار کا فلم دیکھنے نہیں جاتا تھا۔ وہ صرف
فلم دیکھنے جاتا تھا۔ کیسا بھی ہو، کسی کا بھی ہو "جو کچھ ملے، جہاں بھی ملے،
جس قدر ملے"

مگر جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اور اس کا شوق تیز تر ہوتا گیا، سینما
کی کشش ایک مبہم اور بے نام جذبے کی حد سے نکل کر مخصوص اور معلوم
شکلیں اختیار کرتی گئی۔

گوہر کا گداز جسم۔

ماسٹر وٹھل کی پھرتی اور شہسواری اور اس کا کسرتی بدن
سلوچنا کی گوری رنگت، چمکیلے سیاہ بال اور بڑی بڑی آنکھیں،
بلموریا کی باریک اور نکیلی مونچھیں۔
مادھوری کی تیزی اور طراری ارملین کا چلبلا پن۔
چارلی غوری ڈکسٹ کی دھما چوکڑی جس کو دیکھ کر پیٹ میں ہنسی کے
مارے بل پڑ جاتے تھے۔
خوبصورت آنکھوں والی زبیدہ "الف لیلیٰ کا فرجوانی جوبن پر
آئی ہوئی!"

اور پھر ہندوستانی فلم بول پڑے۔ اور "حسن نگاہ و داب ما فردوس
گوش" بھی بن گئی۔ نہ صرف آنکھ کے راستے بلکہ کان کے راستے بھی یہ چلتی
پھرتی تصویریں۔ یوں میں گھر کرنے لگیں۔
اب وہ کجن کی نقرئی آواز

ماسٹر نثار کی سریلی تانیں۔

آغا حشر کے لکھے ہوئے پر رعب مکالمے

اور پھر سہگل — جادو بھری آواز والا سہگل۔

اور زبیدہ کا وہ ایک انوکھے انداز سے تتلا تتلا کر بولنا!

سورج نے کسی نہ کسی طرح مڈل پاس کر لیا۔ اس کا باپ جو پنساری کی دکان کرتا تھا، چاہتا تھا کہ اب بیٹا پڑھائی چھوڑ کر اس کا ہاتھ بٹائے۔ مگر سورج کا دل سینما کی رومانی رنگینیوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس کو کب گوارا تھا کہ اپنی زندگی سونف، کالی مرچ، ہلدی اور نمک کی پڑیاں باندھنے میں گزار دے اور ایک بار اسکول چھوٹ گیا اور دوکان پر بیٹھنے کا معمول بن گیا تو پھر سینما دیکھنے کی مہلت بھی کب ملنے والی تھی! حالانکہ اس کا دل پڑھائی میں ذرا بھی نہیں لگتا تھا، مگر اس نے یہی بہتر سمجھا کہ باپ کو سمجھا بجھا کر دو سال اور ہائی اسکول میں گزارنے کی مہلت حاصل کرے اور اس عرصے میں کوئی ایسی ترکیب نکالے جس سے وہ بمبئی کی فلمی دنیا میں قدم رکھ سکے۔

اب اس کی عمر سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ تنا صاف کھلتا ہوا رنگ ناک نقشہ برا نہیں، قد ساڑھے پانچ فٹ سے کچھ زیادہ ہی، لمبے بال جو بڑی محنت سے گھونگھر والے بنائے گئے تھے۔ ہر بار جب وہ آئینہ دیکھتا اس کو یقین ہو جاتا کہ ایک بار کوئی ڈائرکٹر اس کو دیکھ لے تو پھر ہر اسٹوڈیو کے دروازے اس کے لئے کھل جائیں گے۔

اس سال رام لیلا کا میلا لگا تو اس میں دلی کے ایک فوٹوگرافر نے دکان

جمائی: "ایک روپیہ میں آٹھ فوٹو"۔ اور مزا یہ کہ پانچ منٹ میں تیار۔ سورج سب
سے پہلے پہنچا۔ باپ سے چھپا کر ایک ٹائی "ہر مال ملے گا ساڑھے نو آنے میں" سے
لی تھی۔ وہ کالردار قمیص میں لگائی۔ اوپر وہی اسکول والا کوٹ۔ نیا دھلا اور
استری کیا ہوا۔ فوٹو میں تو صرف گردن سے ذرا نیچے تک آنے والا تھا۔ معلوم ہوگا
سوٹ پہنے ہے۔ فوٹو کھنچنے شروع ہوئے۔ سورج نے فلمی رسالوں میں ایکٹروں
کی تصویروں کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ وہی "پوز" دینے شروع کئے۔ فرنٹ
ویو، سائڈ ویو، پروفائل۔ تھری فورتھ۔ فوٹوگرافر نے دو چار [illegible] ٹوپیاں
رکھ چھوڑی تھیں۔ ان میں سے بڑے بڑے چار خانوں کی ایک "ناٹی کیپ"
سر پر جما کر ایک فوٹو امریکن ایکٹروں کی وضع کا۔ پھر ٹوپی اور ٹائی اور کوٹ اتار
ڈالا۔ قمیص کا کالر اوپر چڑھ گیا۔ بال بکھر گئے [illegible] اور
عشق کا جنون۔ یہ ہوا "ناکام عاشق"۔ پھر [illegible] اور
چڑھ گئیں۔ فوٹوگرافر نے بیئر کی خالی بوتل میں کاغذ کے پھول رکھ چھوڑے تھے [illegible]
لپک کر اُسے اٹھا لیا۔ تو یہ ہوا "آنکھوں کا نشہ"۔ اب [illegible] فوٹو [illegible] ان میں
کیا کیا جائے [illegible] فوٹوگرافر نے "ایکٹر" بننے کے خواہشمند نوجوانوں کے فوٹو لینے
ہی میں [illegible] اس نے فوراً ایک بنی بنائی داڑھی مونچھ پیش
کی۔ سورج نے [illegible] داڑھی [illegible] لی اور بغیر
میک اپ کے اپنے چہرے پر بڑھاپے کے آثار نمودار کرنے کی کوشش
کی۔ یہ ہوا "یہودی کی لڑکی" کا بوڑھا باپ"، یا "بدنصیب قیدی" [illegible]
ڈائرکٹروں اور پروڈیوسروں [illegible] شیکسپیرین ایکٹنگ کے میدان

میں بھی اپنے جوہر دکھا سکتا ہے۔

اس رات کو کندن کمار نے جنم لیا۔ جب وہ فلم کمپنیوں کے نام خط لکھنے بیٹھا تو دفعتاً اُسے خیال آیا کہ سورج مل ایک نہایت غیر رومانی اور گھٹیا قسم کا نام ہے۔ اس نام کے لڑکے کو کوئی ہیرو نہیں بنائے گا پھر کون سا نام اختیار کیا جائے۔؟ جب سے کہ ارشد ”پورن بھگت“ میں نام پیدا کیا تھا ”کمار“ تو ہیرو کے نام کا ایک لازمی جزو ہو گیا تھا۔ اشوک کمار۔ سوشیل کمار۔ انیل کمار سنیل کمار۔ دلیپ کمار۔ راج کمار۔ وکمار۔ اور پھر ان میں سے کسی کا اصلی نام بھی تو کمار نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اشوک کمار کا اصلی نام گنگولی تھا اور خود کمار کا نام میر علی۔ تو پھر سورج مل ہی کیوں نہ ہنگل سے اس کے نام کا پہلا حصہ ہٹا کر کندن کمار رکھ دیا جائے۔ ... غرض خطوط اور فوٹو فلم کمپنیوں کے نام روانہ کر دیئے گئے اور اب اسے ایک کے بعد ایک کریڈٹ ٹائٹل نظر آتے رہتے۔

بمبئی ٹاکیز پیش کرتے ہیں

کندن کمار

اِن

... ...

بمبئی ٹاکیز پیش کرتے ہیں ..

نیو تھیٹرز پیش کرتے ہیں ... ..

... پیش کرتے ہیں ... ..

منروا مووی ٹون پریزنٹس ... ...

رنجیت فلم کمپنی پریزنٹس ... ...

اور پھر بیک گراؤنڈ میوزک کی جھنکار کے ساتھ ایک پردے
پر نام چمکتا ہوا ... ...

کندن کمار!

کندن کمار!!

کندن کمار!!!

کندن کمار!!!!

کندن کمار!!!!!

کنـــدن!

"ابے او کندن! سوتا ہے کیا؟" نمبر تا میں آنند"
ایک لمحے کے لئے لائٹ قلی، کندن فلم اسٹار، کندن کمار کے سپنوں
میں کھو گیا تھا۔ اسسٹنٹ کیمرہ مین کی پکار پر وہ ہڑبڑا اٹھا۔

شاٹ ختم ہو گیا تھا۔ اور سب روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ صرف کندن کی
نمبر تا میں کی روشنی ایک پیلے دائرے میں مس شکنتلا پر پڑ رہی تھی جس
نے ابھی ابھی فلم کے آخری شاٹ کے ڈائلاگ بولے تھے۔ چالیس فٹ نیچے
سیٹ کی ہر چیز — دیواریں جو لکڑی کے ٹیکوں کے سہارے کھڑی تھیں
اسٹینڈز پر لگی ہوئی لائٹس، کیمرہ، اس کے پیچھے رکھی ہوئی کرسیاں — کھلونا
معلوم ہوتی تھیں اور ہر شخص گڑیا معلوم ہوتا تھا۔ مس شکنتلا، دیپ کمار،

ڈائرکٹر باسو جو ابھی تک طے نہ کر پایا تھا کہ شاٹ کو "اوکے" کہے یا "این جی" اور برابر بڑبڑائے جا رہا تھا: "ٹھیک تھا... ٹھیک تھا... مگر یہ پکچر کا لاسٹ شاٹ ہے۔ اپنے کو کچھ اور مانگتا... کوئی پکٹوریل ایفیکٹ..." اور پھر اس نے نہ جانے کیا دیکھا یا سوچا اور اپنی مخصوص جوشیلی آواز میں چلا اٹھا "

"آئی گیٹ اٹ۔ دس از وہاٹ آئی وانٹ!"

اور اسی وقت کندن نے اپنی لائٹ کو بجھا دیا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے حیرانی ہوئی۔ "ہاؤس لائٹ" میں سیٹ کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ مگر ڈائرکٹر باسو کی آواز سنائی دی۔

"ایکدم بیسٹ! وہی لائٹ تو اپنے کو مانگتا"۔

اور پھر اسسٹنٹ کیمرہ مین کی دہاڑتی ہوئی آواز۔

"نمبر ستائیس آن کرو"

بتی بجھاؤ!

بتی جلاؤ!

اندھیرا اور اُجالا۔ اُجالا اور اندھیرا۔

کندن نے لائٹ جلا دی۔

اب اس نے دیکھا کہ ڈائرکٹر باسو مسٹر کھنّا کو اس لائٹ کے دائرے میں مختلف زاویوں سے کھڑا کر کے دیکھ رہے ہیں۔ اور کہتے جا رہے ہیں "اب کچھ بنا یہ شاٹ"۔

اور پھر ڈائرکٹر اور دوسرے کیمرہ مین چندو بھائی کی ایک کانا پھوسی

کانفرنس ہوئی جس میں وہ صرف ... بار بار نمبر تین ... کا ذکر ہی رہا تھا۔ اور کندن
سوچنے لگا "آج تو میری لائٹ کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے" ..

کیمرہ مین گجراتی اور ڈائرکٹر بنگالی اسسٹنٹ [illegible] پان چند [illegible] بڑی
دیر تک بحث ہوتی رہی اور آوازیں بتدریج بلند ہوتی گئیں۔

"ہم بولتا، چندو بھائی، ہم کو یہ ایفکٹ مانگتا" ..

"وہ ٹھیک ہے صاحب۔ پرانے اوبجکٹ سے صرف ایک لائٹ
دیں گے تو ایک دم کچھ ڈارک ہو جائے گا، مگر کم سے کم دو تین سپاٹ اور
دو تین بے بی دیں تو ... ..."

"نو۔ نو۔ یو ڈونٹ انڈرسٹینڈ، چندو بھائی۔ اپنے کو ایک لائٹ کا
سرکل مانگتا۔ بس جب کیمرہ کرین پر اوپر ٹاپ شاٹ میں جائے گا اس لائٹ
کے سرکل میں ہیروئن کھڑی ہوگی ... ... اوپر دیکھتی ہوئی ... لائٹ اس کی
آنکھوں میں ... ..."

"پر باسو صاحب ... چالیس فٹ اوپر سے لائٹ دیں گے تو اس کا
سرکل بہت بڑا ہو جائے گا اور لائٹ اتنی ڈفیوز diffuse ہوگی کہ کچھ
رجسٹر register نہیں ہوگا"۔

"ہم نہیں جانتے۔ تم کیمرہ مین ہے۔ کوئی ترکیب نکالو"

کندن جو [illegible] اپنی کارگزاری دکھانے
اور اپنی اہمیت جتانے کو [illegible] چندو بھائی۔
اگر لائٹ چالیس فٹ [illegible]

جب لائٹ تلی کو دخل در معقولات کرتے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ چندو بھائی کا جی چاہا اسے جھڑک دے مگر پھر اسے خیال آیا کہ کندن کی تجویز کچھ بری نہیں ہے۔

ڈائریکٹر باسو تو کھل گئے "یس یس۔ ویٹ از رائٹ۔ لائٹ نیچے آ جائے تو [illegible] چھوٹا ہو جائے گا اور [illegible] diffuse بھی نہیں ہوگا۔

"پھر ہیرو [illegible] پہننا [illegible] لگانے اور لائٹ فکس کرنے میں کئی چار گھنٹے لگ جائیں گے"۔ چندو بھائی نے بیٹے سے معاملہ صاف کر دینا چاہا۔ سمجھا کیونکہ [illegible] میں جو دیر لگی تھی اس کا ذمے دار اسی کو ٹھیرایا جاتا تھا۔

"کوئی بات [illegible]"۔ ڈائریکٹر باسو نے فیصلہ کن انداز میں کہا "مگر [illegible]

[illegible] نئے سیٹ [illegible]

[illegible] اری [illegible]

[illegible] اگر [illegible] آدھے گھنٹے

[illegible] کر دو"

[illegible] بادشاہ [illegible] ڈکٹیٹر [illegible] تھا

[illegible] لائٹ [illegible] کو [illegible]

[illegible]

[illegible] کو بھی سخت

سست کہنے کا اختیار رکھتا ہے تو وہ سیٹھ جی ہیں۔ ان کے سامنے کسی اور کو بولنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ پر آج وہ ہر خطرے میں پڑنے کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بغیر اس کو ترقی کرنے کا کوئی موقع نہ ملیگا۔

"سیٹھ جی!" وہ چلایا "میں پانچ منٹ میں لائٹ نیچے کئے دیتا ہوں۔"

اسٹوڈیو کے کھلے خول میں اتنے اوپر سے اس کی آواز خوفناک طریقے سے گونجی۔ اس کی جرات بلکہ بے ادبی پر سب دنگ رہ گئے۔ اس کے ساتھی دوسرے قلی تو سمجھے کہ آج کندن کی خیریت نہیں۔ یہ ضرور اسٹوڈیو سے نکالا جائے گا۔ پر سب کو حیرت ہوئی جب سیٹھ جی اوپر دیکھ کر بولے۔

"کیسے کرے گا؟"

"ابھی دکھاتا ہوں"۔ اور یہ کہہ کر کندن نے پٹڑے کے دونوں طرف مزید مضبوطی کے لئے جو فالتو رسی کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے انھیں نکال لیا۔ اب پٹڑا گاڈر میں اکہری رسی سے لٹکا ہوا رہ گیا۔ مگر رسی مضبوط تھی اور کندن کا وزن کچھ زیادہ نہیں تھا۔ سستے ہوٹلوں میں کھاتے کھاتے دس سیر کم ہو چکا تھا، اس نے رسی کے ٹکڑوں کو مضبوط گرہیں باندھ باندھ کر بیس فٹ لمبا کر لیا اور ایک سرا پٹڑے میں باندھ کر اور دوسرا سرا لائٹ کے کٹڑے میں ڈال کر لائٹ نیچے لٹکا دی۔ سب اس کی سمجھ اور پھرتی کے قائل ہو گئے۔ خود سیٹھ جی نے "چھپے گا۔ چلے گا" کہہ کر اس کی داد دی۔

"لائٹ آن"

"روشنی کا گھیرا سِ شکنتلا پر پڑا۔ بالکل ٹھیک۔ نہ ایک فٹ اِدھر نہ ایک فٹ اُدھر۔ مگر جسپند و بھائی کبھی کسی لائٹ سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کو ایک دفعہ پورا ہارڈ کرا کے پھر پورا سو فٹ نہ کرا دے۔

"ٹھیک ہے۔ پر ذرا اور نیچے ہو جائے تو اچھا رہے گا"

اب مشکل یہ تھی کہ رسی اتنی ہی تھی۔ لائٹ کو نیچے کیا جائے تو کیسے۔ مگر آج کندن ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے رسی کو ٹپڑے میں سے کھول لیا۔ بائیں ہاتھ سے ٹپڑے کو مضبوطی سے پکڑا اور داہنے ہاتھ میں رسی کے سرے کو تھام کر لائٹ کو دو فٹ اور نیچے لٹکا دیا۔

"ٹھیک ہے"

"ریہرسل!"

"ساؤنڈ ریڈی فور ریہرسل"

"یس مس شکنتلا"؟

"بھگوان — مجھے سندر کے راستے پر ..." اور مس شکنتلا اٹک گئیں کیونکہ جب انھوں نے اوپر بھگوان کی طرف دیکھا تو ایک من وزنی لائٹ کو عین اپنے سر پر لٹکا پایا۔

"یہ لائٹ میرے اوپر گر پڑی تو کون ذمہ دار ہوگا"

اور اب کندن کو اس کا ذمہ بھی لینا پڑا۔ "گھبرائیے مت، مس

شکنتلا [illegible] آج [illegible] وہ دل ہی دل میں خوش تھا

وہ آج پہلی بار [illegible] سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ کون جانتا

ہے کل اس کے ساتھ دیپ کمار کے بجائے شاید میں خود ہی پارٹ کر رہا ہوں۔

پھر سے شکنتلا نے جادو بھری [illegible] ہوا، سیٹیاں

[illegible] ہوئے اور [illegible] ہوا۔

[illegible]

"دوست [illegible]

"کیمرہ! کلیپ"

کیمرہ کرین پر [illegible] آہستہ شکنتلا کے کلوز اپ

سے کیمرہ پیچھے [illegible] ہوتا چلا گیا۔

اور چاندنی [illegible] اپنے تخت پر ننگا ہوا ایک ہاتھ سے

سہارا لئے ہوئے اور [illegible] لائٹ لٹکائے ہوئے کمل [illegible]

سوچ رہا تھا

"یہ شاٹ میرا [illegible] تو کبھی اس طرح نہ لیا جاتا"۔ [illegible] اس کی

پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ [illegible] اس کے دائیں ہاتھ کی رگیں کھنچی [illegible]

[illegible] بایاں [illegible]

الفاظ گونج رہے تھے [illegible]

پیچھے کی طرف نظر کی تو بست [illegible] کیمرہ [illegible]

گھومتی نظر آئی

جب شاٹ ختم ہوا تو سشمیتا نے اپنی نظر اوپر اٹھائی۔ بھگوان کو [illegible]
کندن کی طرف۔ روشنی جیسے اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ کندن کو دیکھ نہ
دیکھ سکتی تھی مگر وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ جیسے چہرے کو سفید اوڑھنی
کے آنچل میں نورانی معلوم ہو رہا تھا ...

اور کندن ایک جھٹکے سے ہوش میں آ گیا کہ وہ ایک ہاتھ سے وزنی
لائٹ سنبھالے ہوئے ہے۔ پتلے تختے کا توازن بگڑ گیا اور رسی سنبھال لی
نہیں مگر ایک طرف کو دفعتاً اس طرح کھنچ گئیں کہ کندن کو محسوس ہوا جھٹکا لگا،
اگر اس کا بایاں ہاتھ رسی سے لپٹا نہ رہتا تو پتہ نہ لگتا اور وہاں اس کی انگلیاں
مضبوطی سے نہ جم جاتیں اور اگر لائٹ والی رسی پر اس کے داہنے ہاتھ کی گرفت
ذرا بھی ڈھیلی پڑ جاتی تو لائٹ اور کندن دونوں چالیس فٹ نیچے سشمیتا
کو چکنا چور کرتے ہوئے اسٹوڈیو کے سیمنٹ کے فرش پر آ رہتے۔ موت کے
خوف کی سنسناہٹ اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ پھر اس [illegible]
سے بھی زیادہ اسے اپنے وعدے کی فکر تھی جو اس نے سشمیتا سے کیا
تھا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں رسی میں گڑ گئیں اور اس نے لائٹ کو
ہلنے تک نہ دیا۔

شاٹ جاری رہا۔ اس ڈرامے سے بے خبر سشمیتا اپنا
ڈائلاگ بولتی رہی۔

”اے بھگوان! مجھے [illegible]
سوائے چند دوسرے لائٹ والوں کے جن کے منہ سے تقریباً چیخ نکل گئی

تھی اور سیٹھ جی کے جو کونے میں کھڑے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ اس شاٹ کی خاطر کندن نے تقریباً اپنی جان ہی دے دی۔

شاٹ ختم ہو گیا۔

"ہاؤ از دیٹ فور ساؤنڈ؟"

"او کے"

"او کے"

"او کے"

ڈائرکٹر باسو خوش تھے۔ مس شکنتلا کو مبارکباد دے رہے تھے

چندو بھائی خوش تھے۔ اپنے اسسٹنٹ کو بتا رہے تھے کہ اس قسم کے لائٹ افکٹ میں کوئی دوسرا کیمرہ مین ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا مس شکنتلا خوش تھیں اور ویمپ کمار کو بتا رہی تھیں کہ ایسے شاٹ میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایکٹنگ کرتی ہیں "اگر مجھ پر اوپر سے وہ لائٹ گر بھی پڑتی تو مجھے پتہ نہ چلتا" اور انھیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی موت اس کے کتنے قریب سے گزر گئی تھی۔

یہ آخری شاٹ تھا۔ سب رخصت ہونے لگے۔ کندن نیچے اتر آیا۔ اور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گیا کہ سیٹھ جی اس کے انتظار میں کھڑے تھے

"اے کیا نام ہے تیرا؟"

"کندن سیٹھ جی"

"شاباش۔ تو بڑے جگرے کا آدمی ہے۔ ہم نے دیکھا تو نے مس شکنتلا

کا جان بچالیا "

"یہ تو میرا فرض تھا سیٹھ جی ... "

"بول کیا انعام چاہیے ؟ "

کب سے وہ اس لمحے، اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ میں یہ کہوں گا۔ میں یہ کہوں گا : "سیٹھ جی مجھے ایکٹنگ کا چانس چاہیے۔ میں ہیرو بننا چاہتا ہوں ۔ ایک بار ۔ بس ایک بار ۔ موقع دیجئے " مگر اس وقت اس سے کچھ نہ کہا گیا ۔ سو سیٹھ جی ہی بولے ۔

"اچھا کل آفس میں ملو ۔ ہم تم کو کوئی انعام بھی دے گا اور کوئی اسپیشل کام بھی دے گا "

اور جب کندن اسٹوڈیو سے باہر آیا تو سب کی نظریں اس پہ تھیں اور اس کے قدم زمین پر نہیں ہوا پر پڑ رہے تھے ۔

دوسری اپیل

ہے دربار سین کے واسطے "۔ مرزا جو الیف اے فیل تھا اور شمالی پنجاب کا رہنے والا تھا اور جس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا اور جو ایک وقت میں تیس پچیس چپاتیاں کھا سکتا تھا اور جس پر کسی لڑکیاں جان دیتی تھیں ڈیڑھ برس سے فلمی قلعہ کو سر کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر سوائے موہن کی ایک اسٹنٹ فلم کے جس میں اس نے چارخانے کی قمیض اور برجیس پہن کر ایک دلایتی قسم کے گنڈے کا پارٹ کیا تھا اس کو کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ ایکسٹرا کی حیثیت سے آٹھ دس دن بھیڑ کے کسی سین میں کھڑے ہونے کی جگہ مل جائے اسی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ آج رنجیت [illegible] ہے تو کل راج کمل میں سا دھو پرسوں منروا میں مغل [illegible] تو اس [illegible] بکرا [illegible] کا سینک۔ وہ بمبئی میں ایکسٹرا کا کام [illegible] اشاد [illegible] آیا تھا کہ مشکل یہ تھی کہ اس کو بھوک بہت لگتی تھی۔ [illegible] اس لئے جب چھ ماہ تک [illegible] بعد [illegible] تو اس نے بھی شرم کو بالائے طاق [illegible] اور [illegible] کے ہاں اپنا [illegible] دیا۔

ہاں تو جب مرزا نے کہا

"کیوں بے کندن [illegible] کا [illegible] تو [illegible] چھوڑو یار۔ یہ لالہ صاحب تو جب [illegible] کے سامنے [illegible] آئیں گے [illegible]

[illegible]

جواب دیا "مگر یہ ضرور ہے کہ اکسٹرا کا گونگا کام نہیں کرونگا۔ ویسے ایک لائن بھی بولنے کے لئے مل جائے تو میں تیار ہوں"

"بڑے نخرے ہیں تمھارے۔ مگر یہ لائٹ قلی کا کام کرتے شرم نہیں آتی تمھیں"۔

یہ سروپ کا مستقل تکیہ کلام تھا۔ اپنے دوست اور ساتھی کو یہ "نیچ" کام کرتے دیکھ کر اُسے واقعی شرم آتی تھی۔ اور اس مسئلے پر روز اس کی اور کندن کی بحث ہوتی تھی۔ سروپ کانپور میں بی اے میں پڑھتا تھا جب وہ اپنی سوتیلی ماں کے ظلم سے چھٹکارا پانے کے لئے بمبئی چلا آیا تھا۔ رنگ گورا اور صورت شکل اچھی تھی۔ گانا بھی تھوڑا بہت جانتا تھا۔ یار لوگوں نے صلاح دی کہ فلموں میں قسمت آزمائی کرو۔ دس مہینے سے کر رہا تھا۔ قد کسی قدر چھوٹا تھا۔ پھر بھی وہ کرن دیوان سے دو انچ لانبا ہی تھا اور ایسے موتی لال ہی کون ساچھ فٹ ہے! مگر پروڈیوسروں ڈائرکٹروں کو اُسے نہ لینے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ ایک جگہ سنا کسی "ننھے چھوکرے" کو ہیرو کے لئے لینا چاہتے ہیں وہاں کوشش کی۔ کامیابی کی امید معلوم ہوتی تھی کہ پروڈیوسر صاحب کو خیال آیا کہ اس کا قد چھوٹا ہے۔ دنیا کے ساتھ جوڑی نہیں سے گی ....

سروپ واپس آیا اور اگلے دن مرزا کو بھیجا کہ شاید اس کی طویل قامت پروڈیوسر صاحب کو پسند آجائے۔ مگر مرزا کو دیکھ کر وہ بولے۔

"ہم تو سنہ پربھا یا نلینی جیونت کو ہیروئن بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ تم تو بہت لمبے ہو۔ جوڑی نہیں سے گی"۔ (یہ اور بات ہے کہ یہی

پروڈیوسر صاحب اپنی پچھلی فلم میں پرتھوی راج اور ثریا کی جوڑی پیش کر چکے تھے ۔) یہ سن کر مسٹر دوبے بے چارہ بھاگا ہوا گیا کہ آپ اگر دیتا کے بجائے سبنہہ پربھا یا نلینی جسونت کو لے رہے ہیں تو مجھے ہیرو کا پارٹ دید یجئے ۔ پروڈیوسر صاحب بولے وہ افواہ غلط تھی وہ واقعی دینا ہی کو لے رہے ہیں ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے سالے کو لے لیا ہے اور ساتھ میں ہیروئن تنا تنا رن کو بنایا ہے ۔

سواس پر مرزا نے (جو فنِ کرپازی کا ماہر تھا) ایک لطیفہ گھڑا جو ہر اسٹوڈیو میں دہرایا جا رہا تھا ۔

پروڈیوسر ایک بڑے اور اہم فلم کی مہورت سے پہلے تمام مشہور ایکٹروں کو انٹرویو کے لئے بلاتا ہے تاکہ ان میں سے ایک کو ہیرو چنا جائے ۔

سب سے پہلے اشوک کمار آتا ہے ۔ مگر اس کو اس بنا پر نامنظور کر دیا جاتا ہے کہ وہ موٹا ہوتا جا رہا ہے ۔

پھر موتی لال آتا ہے ۔ اور اس کو گنجا ہونے کی بنا پر نامنظور کر دیا جاتا ہے ۔

پھر کرن دیوان آتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نازک اندام ہے ۔

پھر شیخ مختار آتا ہے اور اس کو ضرورت سے زیادہ پہلوان ہونے پر "ان فٹ" کر دیا جاتا ہے ۔

پھر سریندر آتا ہے مگر پروڈیوسر صاحب کا خیال ہے کہ وہ بے سُرا

گاتا ہے۔

پھر دیو آنند ——— مگر وہ بہت دبلا ہے

پھر جینت ——— مگر وہ بہت موٹا ہے

پھر واسطی ——— مگر وہ مسخرا معلوم ہوتا ہے اس لئے

وہ سنجیدہ کردار نہیں کر سکتا۔

پھر بھارت بھوشن ——— مگر وہ سادھو معلوم ہوتا ہے اس لئے

مزاحیہ کام نہیں کر سکتا۔

آخر میں پروڈیوسر کا سکریٹری پوچھتا ہے۔ "سیٹھ جی۔ آپ نے تو

ہر ہیرو کو ناپاس کر دیا۔ آخر پھر لیں گے کسے؟"

"وہ تو میں پہلے ہی طے کر چکا ہوں" سیٹھ جی بولے "اپنی بیوی

کے بھائی کے داماد کے سالے کو لونگا"

"آؤ، دادا، آؤ"۔ مرزا نے ایک نو وارد کا استقبال کرتے ہوئے

کہا "بس ہم بھی چلنے کے لئے تیار ہی ہیں"

"کیوں، دادا، کچھ سوڈا لیمن؟" مسرور کے لہجے میں کچھ خوشامد کا

پہلو تھا۔

"نہیں۔ سوڈا دوڈا کچھ نہیں چاہئے۔۔ ٹائم ہو گیا ہے۔ اب چلنا

چاہئے۔ نو بجے جو ملاڈ پہنچنا ہے"

دادا گنتی، جس کو فلمی دنیا کا ہر آدمی "دادا" کے نام سے پکارتا تھا۔

ایک اکسٹرا سپلائر تھا یعنی کمیشن پر فلم کمپنیوں کے لئے اکسٹرا مہیا کرتا تھا

ایکسٹرا کو جو کچھ اسٹوڈیو سے ملتا اس میں سے آدھا دادا کی جیب میں جاتا۔ سینکڑوں نوجوان اور فلمی شہرت کے شوقین لڑکے اور لڑکیوں کا وہ "دادا" نہیں بلکہ "ان داتا" تھا۔ جن سے وہ خوش رہتا تھا ان کو مہینے میں دو سو تین سو روپے تک کی آمدنی ہو جاتی تھی اور جن سے ناراض ہوتا تھا ان کو دوسرے ایکسٹرا سپلائر بھی کام دلواتے گھبراتے تھے کہ کہیں دادا کو معلوم ہو جائے اور اس کا غصہ ان پر اترے۔ مرزا اور سروپ نے مدت تک دادا کے وسیلے کے بغیر کام ملنے کی کوشش کی تھی مگر ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنے کے بعد انھوں نے بھی اس کی خوشامد شروع کر دی تھی۔ یہ دونوں پڑھے لکھے، خوش پوش اور اچھے گھرانوں کے لڑکے تھے۔ ایسے ایکسٹرا مہیا کرنے سے اسٹوڈیوز میں دادا کی ساکھ بڑھتی تھی اس لئے وہ بھی ان پر خاص عنایت رکھتا تھا اور دور جانا ہو تو اکثر اپنی کھٹارا قسم کی موٹر میں ساتھ ہی لے جاتا تھا۔

پرنہ جانے کیوں کندن کو دادا کی شکل سے وحشت ہوتی تھی۔ اول تو اس کی شکل بھی تھی ہی خوفناک۔ گہرا سانولا رنگ۔ جس پر پچاس سالہ عیاشی کی زندگی کے گہرے نقوش۔ اس پر داڑھی ہمیشہ تین چار دن کی بڑھی ہوئی۔ سر پر گنج اور ایک داہنی آنکھ کی پیپری بھی ہوئی جس میں سے کبھی کبھی پیلا پیلا پانی بھی بہتا رہتا تھا۔ بائیں گال سے لے کر پیشانی تک ایک پرانے زخم کا نشان۔ کہتے ہیں کہ برسوں ہوئے کسی طوائف کے کوٹھے پر دادا کا کسی دوسرے موالی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے چاقو چلے۔ دادا کو گہرا زخم آیا دس دن بعد ہسپتال سے گھر آ گیا۔ مگر اس کے رقیب کی لاش راتوں رات

کوٹھے سے سیدھی شمشان لے جائی گئی۔ دادا گنجا اس زخم کے نشان کو بڑے فخر سے دکھاتا تھا۔ وہ اکثر کہتا: "اسے دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ دادا گنجا کے مقابلے میں آنا کتنا خطرناک ہے۔" اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ نشے کے لال لال ڈورے ہوتے تھے اور منہ سے "ٹھرّے" اور تاڑی کی بو آتی تھی۔

باوجود اس حلیے کے دادا گنجا اپنے آپ کو بڑا رنگیلا سمجھتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ہر رات ایک نئی عورت اس کے پہلو میں ہوتی ہے۔ سینکڑوں ایکسٹرا لڑکیوں سے وہ اپنی عنایت کی قیمت وصول کر چکا تھا۔ اس کی ہوس کی پیاس بجھائے بغیر کسی ایکسٹرا لڑکی کو کام ملنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ایک لڑکی نے انکار کر دیا تھا تو دادا نے رات کے اندھیرے میں اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا تھا اور وہ بے چاری عمر بھر کے لئے منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

ان سب قصوں کو سن کر کندن کو دادا کی شکل سے گھن آنے لگی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ بغیر ایسے خوفناک آدمی کو دشمن بنائے اس سے الگ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ سڑک پر سے آتا دیکھتا تو راستہ کاٹ جاتا۔ مگر دادا اس پر خاص نظرِ عنایت رکھتا تھا۔ اسے شکایت تھی کہ کندن کبھی اس کے رجسٹر پر اپنا نام کیوں نہیں لکھوا لیتا۔ اور جب کبھی وہ ملتا وہ اس بات کی یاد دہانی ضرور کرتا۔

"کیوں کندن بابو!" آج بھی اس نے آتے ہی پرانا قصہ چھیڑ دیا۔

"تم تو بڑے آدمی ہو۔ ایکسٹرا کا کام کیوں کرنے لگے۔ پر یاد رکھو۔ میں نے درجنوں کو ہیرو ہیروئن بنا دیا ہے درجنوں کو۔ اگر سال بھر میں تمھیں لیڈنگ رول نہ دلوا دوں تو میرا نام بھی دادا گجی نہیں۔" اور پھر اپنا منہ اتنے قریب سے جاکر کرکندن کو تاڑی کے بھبکے آنے لگے "لونڈیاں جو ملیں گی وہ الگ۔ تمھارے جیسے لونڈے کے پیچھے تو کتیوں کی طرح بھاگیں گی۔ کیوں کیا کہتے ہو؟"

کندن نے بات ٹالنے کی غرض سے گفتگو کو مزاحیہ رخ میں پھیرنے کی کوشش کی "جاؤ بھی دادا۔ بس دیکھ رکھا ہے تمھاری ایکسٹرا لڑکیوں کو۔ نہ جانے کہاں کا کوڑا کرکٹ اٹھا لاتے ہو۔ ایک کی بھی تو ڈھنگ کی صورت شکل نہیں ہے۔"

اس قسم کے مذاق سے دادا بڑا خوش ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ ہر شخص سے اسی سطح پر بات چیت کرنے کا عادی تھا۔ فلم انڈسٹری میں اسے اگر چڑ تھی تو ان لوگوں سے جو یا تو پڑھے لکھے تھے یا شریف خاندانوں کی روایات کا دعویٰ کرتے تھے۔ پڑھے لکھے ایکٹروں اور اچھے خاندان کی ایکٹرسوں کا وہ ہمیشہ مذاق اڑایا کرتا۔ یا ان کو بدنام کرتا پھرتا۔ اس لئے کہ وہ اس کو منہ نہ لگاتے تھے اور ان کے سامنے اسے اپنی کمتری اور رذالت کا شدید احساس ہونے لگتا تھا۔ اس لئے اسے جب کبھی بھی موقع ملتا وہ پڑھے لکھے ایکسٹرا لڑکوں کو مفت شراب پلا پلا کر اور آوارہ ایکسٹرا لڑکیوں سے میل ملاقات کرا کے ان کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ سروپا اور مرزا بھی تک [illegible] نہیں ہوئے تھے مگر اس کی خوشامد ضرور شروع

کر دی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ بہت جلد مکمل طور سے "راہ راست" پر آجائیں گے۔ اگر کوئی اب تک اس کے جال میں نہیں پھنسا تھا تو وہ کندن تھا اس لئے دادا اس تاک میں تھا کہ اس سر پھرے لونڈے کو رام کرنے کے لئے کون سی چال چلے۔ جیسے ہی کندن نے اکسٹرا لڑکیوں کی بدصورتی کا طعنہ دیا وہ خوشی سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"لونڈے ہو کندن بابو۔ لونڈے۔ تم کیا جانو کام کی لونڈیا کیسی ہوتی ہے۔ عورت کی شکل سے کیا لینا۔ رات کے اندھیرے میں کالی گوری سب ایک جیسی دکھتی ہیں۔ اصل چیز تو کچھ اور ہی ہے۔ مسٹر"۔ یہ کہہ کر اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ایک مکروہ نشان بنایا جس کو دیکھ کر کندن کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ دادا اس کے مذاق کو کہاں سے کہاں لے جائے گا۔

"اچھا خیر" دادا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آؤ تمہیں ایک تحفہ مال دکھاتا ہوں۔ تم بھی قائل نہ ہو جاؤ تو دادا اگنی نام نہیں۔ آدھی مرزا اور بہروپ۔ تم بھی کیا کہو گے کہ دادا کی پہنچ کہاں تک ہے"

یہ کہہ کر وہ ان سب کو موٹر کی طرف والی کھڑکی تک لے گیا اور باہر اشارہ کیا جہاں اس کی موٹر کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کندن کہا تھا دادا اگنی کی مستقل کا فی گھمدی بھدی لڑکیوں میں سے کوئی ہو گی۔ سیاہ مت پر پاؤڈر کی تہہ جمائے۔ سبز ہونٹوں پر لال لپ اسٹک ملے۔ کانوں میں پیتل کے لمبے لمبے جھولتے ہوئے بندے، اور تنگ بلاؤس میں سے

ابھرتا ہوا سینہ۔ مگر یہ تو کوئی اور ہی قسم کی لڑکی تھی۔ اول تو وہ بہت ہی کم
عمر معلوم ہوتی تھی۔ شاید سترہ سال سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کے
گیہواں چہرے پر متانت [illegible] کا نام نہیں تھا۔ لمبی سی سفید ساڑھی جس کا
پلو سر پر تھا۔ دونوں [illegible] نظریں نیچی کئے کھڑی تھی۔ کسی طرح سے فلمی ایکسٹرا
نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پھر رندن کو خیال ہوا شاید یہ معصومیت بھی ایک فریب
ہو [illegible] کی [illegible] ایک [illegible] ہے۔

"کیوں کیا کہتے ہو؟ بہت مال ہے بیبا؟"

"لونڈیا بہت [illegible]" [illegible] نے تجربہ کار لڑکی باز کی حیثیت سے
اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"شکل صورت سے کوئی سیدھی معلوم ہوتی ہے" روپا
نے کہا "گھر سے بھاگ کر نہیں آتی ہے۔ کہیں اس کے گھر والوں کے
ساتھ مقدمہ بازی میں نہ [illegible] جائے دادا۔"

دادا نے [illegible] ایک خوفناک قہقہہ لگایا "دادا کچی گولیاں
نہیں کھیلا [illegible] تو باپ خود میرے سپرد کر گیا ہے۔ نہ
جانے کہاں سے [illegible] آج ہی صبح پہونچ گیا میرے
گھر پر۔ [illegible] فلم میں کام کرنے کا بڑا شوق ہے
اسے کہیں [illegible] کرونگا۔ ویسے تو لڑکی
لڑکی کی شکل صورت [illegible] ہے۔ خیر آسٹر [illegible] ہو جائے گی۔ آج
[illegible] کیمرے [illegible] جانے لگا۔ اس پر

وہ بڈھا کہتا ہے تو میں اسے چھوڑے جاتا ہوں۔ ہاں ایک پانچ روپے پیشگی مل جائیں تو بڑی مہربانی ہو۔ سو تین روپے دے کر اسے رخصت کیا تو چلتے جاتے کہتا ہے داوا۔ ذرا میری لڑکی کا خیال رکھنا۔ میں نے کہا فکر نہ کرو ایسا خیال رکھونگا کہ یاد ہی تو کرو گے "

مرزا ذرا زیادہ بے تکلف تھا۔ بولا " کیوں داوا تو پھر کچھ ریہرسل وغیرہ ہوا ابھی ... ؟ "

داوا کے جواب میں اتنی گرمجوشی نہ تھی " ہاں ... ہوا ... مگر ابھی ذرا بدکتی ہے۔ خیر دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔ میں نے اس کے باپ سے کہہ دیا ہے کہ رات کو دیر ہو جایا کرے گی تو میں خود پہنچا دیا کرونگا "

" بڑے استاد ہو تم بھی۔ داوا کچا دیکھو نہ پکا مال ہڑپ کر جاتے ہو " مرزا نے کہا اور ان الفاظ میں اپنی " مردانگی " کی تعریف سن کر داوا کھل گیا۔ بڑے انکسار سے بولا " ہاں۔ بھیا۔ کچھ دال دلیا تو ہونا ہی چاہیئے نہیں تو ہم بے چارے تو بھوکے ہی مر جائیں " اور پھر کھڑکی کی طرف دیکھ کر " کیوں، کندن بابو۔ کیا سوچ رہے ہو ؟ بولو کیا رائے ہے ؟ "

کندن کی نظریں ابھی تک کھڑکی کے باہر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا " یہ لڑکی کسی شریف گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ نہ جانے کیوں اس کا باپ اسے داوا جیسے انسانی بھیڑیئے کے سپرد کر گیا ہے۔ اب اس کی خیریت نہیں۔ یہ اسے خراب کئے بغیر چین نہ لے گا۔ اگر مجھ میں اتنی ہمت ہو، اگر میں فلمی ہیرو کی طرح دل گردے والا ہوں، تو اسی وقت نیچے جا کر اس

لڑکی سے صاف کہہ دوں نہ جا اپنے گھر جا۔ کیوں غلاظت اور آوارگی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے آئی ہے۔ دادا گنجا سے خبردار رہ۔ یہ سینکڑوں کی عصمت برباد کر چکا ہے۔ تجھے خراب کرنے میں یہ دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا۔ پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو میں اسے زبردستی اس کے گھر لے جاؤں گا۔ اس کے ماں باپ سے مل کر ان سے کہوں گا کہ اپنی لڑکی کو تباہی سے بچائیں"۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا مگر جب دادا گنجا نے اس سے سوال کیا تو اس نے کھڑکی کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا "ہاں ---- بری نہیں ہے"۔

"اچھا اب چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہو گئی"، دادا گنجا نے اپنی کلائی پر لگی ہوئی سونے کی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس گھڑی پر اسے بڑا ناز تھا۔ ایک بار اس نے نیپین سی روڈ پر ایک راجہ کے محل میں رات بھر ننگا ناچنے کے لیے دس ایکسٹرا لڑکیوں کا انتظام کیا تھا۔ لڑکیوں کو سو روپے فی کس معاوضہ ملا تھا اور اسے پانچسو روپے اور یہ سونے کی گھڑی انعام میں۔

دادا گنجا، سروپ اور مرزا گٹ گٹ کرتے زینہ اترتے ہوئے نیچے چلے گئے اور کندن پھر کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ لڑکی ابھی تک زمین پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ مگر جب دادا گنجا موٹر کے قریب پہنچا تو لڑکی نے نظر اٹھا کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھا، صرف ایک لمحے کے لیے وہ بڑی بڑی آنکھیں بے پردہ ہوئیں اور پھر لانبی پلکوں میں چھپ گئیں۔ پر نہ جانے کیوں کندن کو ان آنکھوں میں سارے گردوں کے غم بیا

اس خاموشی میں ایک عجیب اور عمیق مایوسی نظر آتی جیسے ایک بکری لاچاری سے قصائی کی چھری کی طرف دیکھتی ہے۔ اور کچھ نہیں کر سکتی

دادا گنجی کی موٹر روانہ ہو گئی۔ چند ایکسٹرا لڑکیاں سینوں کو نمایاں کئے ہوئے۔ ٹوٹے چپل پہنے کھوکھلی سی ہنسی ہنستی ہوئی رنجیت سٹوڈیو سے نکلیں اور شری ساؤنڈ اسٹوڈیو کی طرف چلی گئیں۔ ایک ہدایت کار کی شاندار کار زن سے گزر گئی۔ ایک لنگڑاتا ہوا جیا ؤں چیاؤں کرتا ہوا عینک لگا ایک مکالمہ نویس منشی جی، موٹے شیشوں کی عینک لگائے۔ کاغذوں کا پلندہ دبائے ایرانی ہوٹل میں چائے پی کر باہر نکلے اور پھر کچھ سوچ کر امر اسٹوڈیو کی طرف چل دیئے۔ ایک مشہور ہیرو زن کی کھلی ہوئی سبز موٹر سینٹ کی خوشبو بکھیرتی گزر گئی۔ دادر میں روڈ پر جس کو ہندوستان کا ہالی ووڈ کہا جاتا ہے فلمی کارواں گزرتا رہا۔ مگر کندن کو اپنے ذہن میں دادا گنجی کی بو آتی رہی —— جس میں تاری، شراب، سینٹ، پائیریا، دادا کا پیلا پانی، عیاشی، گناہ اور نہ جانے کتنی جنسی بیماریاں سب کا ست تھا۔

تیسرا بیل

(زمیں میں ہیرے، امید کے کہیں جگمگاتے ہوئے چراغ
نظر آتے ہیں)

ابھی دس نہیں بجے تھے کہ کندن سیٹھ صاحب کے دفتر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ عام طور سے سیٹھ گیارہ بارہ سے پہلے کبھی نہیں آتا مگر کون جانتا ہے آج سویرے ہی آ جائے۔ آخر کمپنی کا مالک ٹھیرا۔ جب چاہے آئے جب چاہے جائے۔ اور آج کندن اس بات پر تلا ہوا تھا کہ جب بھی آئے سب سے پہلے سیٹھ کی نظر اسی پر پڑے۔

اسٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں حسب معمول چہل پہل تھی۔ ڈائرکٹر ہنڈا کی شوٹنگ کا "بورڈ" ۹ بجے کا لگا تھا۔ مگر ان کی ہیروئن مس نازنین ابھی نہیں آئی تھیں اس لئے کام رکا ہوا تھا۔ املی کے پیڑ کے نیچے اسسٹنٹ

ڈائرکٹر اور ایک اسسٹنٹ کیمرہ مین کھڑے چند ایکسٹرا لڑکیوں سے مذاق کر رہے تھے۔ دو کیمرہ قلی بھاری بھاری لائٹوں کو اسٹوڈیو نمبر ایک سے اٹھا کر اسٹوڈیو نمبر دو میں لے جا رہے تھے۔ چکنے اور سیاہ اور گٹھے ہوئے بدن کی گھاٹنیں لکڑی کے بھاری بھاری تختے اٹھائے "آرٹ ڈپارٹمنٹ" میں لے جا رہی تھیں۔ اور ایک سوکھے ہوئے جسم اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے "منشی جی" موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے ان مزدور عورتوں کی سڈول ٹانگوں اور ان کے کولھوں کے ابھار کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔

ساڑھے دس بجے تھے کہ مس نازنین کی شاندار سیلی بیکارڈ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی۔ ایک اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے لپک کر موٹر کا دروازہ کھولا۔ دوسرے نے مس نازنین کا میک اپ بکس سنبھالا اور خود ڈائرکٹر ہنڈا جب اپنی ہیروئن کا خیر مقدم کرتے آگے بڑھے تو ان کو مس نازنین کی والدہ نے اپنا نہایت بھاری پاندان تھما دیا۔ ہمیشہ کے معمول کی طرح سب سے پہلے موٹر سے مس نازنین کی نانی بیبی چھنیا بائی اتریں، ان کے بعد مس نازنین خود اور عقب میں ان کی والدہ منی جان۔ اس طرح یہ جلوس اسٹوڈیو کی طرف چلا لیکن موڑ پر غائب ہونے سے پہلے کندن نے سنا کہ چھنیا بائی اپنے پوپلے بن دانتوں کے منہ سے ڈائرکٹر ہنڈا کو نہایت "روح افزا" قسم کی گالیاں سنا رہی ہیں کیونکہ "موتی کانے" پبلسٹی منیجر نے کسی اشتہار میں نازنین کا نام

ہیرو یعنی کمل راج کے بعد لکھ دیا تھا!

تھوڑی دیر کے لئے اسٹوڈیو کے بیرونی احاطے میں سناٹا چھایا رہا۔ مس نازنین کا ڈرائیور مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا موٹر سے اترا اور ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ سیٹھ کے دفتر کے سامنے برآمدے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور دیر تک بجتی رہی۔ کندن کا ارادہ ہوا کہ پوچھے کس کا فون ہے مگر وہ جھجک کر رہ گیا کہ شاید سیٹھ جی کے لئے ہو اور اس جرأت پر اس کو ڈانٹ پڑے۔ آخر کار اندر کے دفتر سے ایک کلرک نکلا اور فون اٹھایا

"ہیلو ... گریٹ آرٹ پکچرز ... کون چاہیے؟ ... مس نازنین؟ ... وہ شوٹنگ میں ہے۔ ہم بلا نہیں سکتے ... تمہارا نام؟ ... نام نہیں بتا سکتے؟ ... نمبر ہو تو ہم لکھ کر بھیج دے گا ... نام بتاتا ہے نہ نمبر تو ہم کیا کرے گا۔ جاؤ بھاڑ میں" یہ کہا اور فون کو دھڑ سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ اور کندن سوچتا رہا یہ کس نے مس نازنین کو فون کیا تھا۔ شاید اس کا کوئی عاشق ہو [illegible] اسی لئے نام بتانے سے انکار کر رہا ہو۔ کتنا خوش نصیب ہوگا وہ [illegible] جیسی حسین لڑکی محبت کرتی ہے! ویسے تو کندن کا نوجوان [illegible] کا دل ہر ایک اسٹار کو دیکھ کر پھسل پڑتا تھا مگر نازنین کی [illegible] سے پرستش کرتا تھا۔ گو یہ لڑکی طوائفوں کے خاندان سے تھی مگر اسے اسکول میں تعلیم دلائی گئی تھی اور اس کے بات چیت کرنے کا ڈھنگ بازاری بالکل نہ تھا اسٹوڈیو میں ہر ایک سے وہ خوش خلقی سے پیش آتی تھی۔ دیو اور با [illegible]

کہ ماں اور نانی کی پہرے داری میں کمی ۔ سے زیادہ بات کرنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا تھا کہ کہیں کسی ایسے ویسے ٹٹ پونجئے نوجوان سے محبت اور شادی ہو جائے اور ان دونوں خرانٹوں کے ہاتھ سے سونے کے انڈے دینے والی مرغی نکل جائے) اور پھر اس کے جھپکے پیادر آنکھوں میں ایک عجیب دلکش قسم کی ہلکی سی افسردگی تھی جس سے اس کے حسن میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا

کندن بینچ پر بیٹھا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے سامنے سے نازنین کو آتے دیکھا ۔ اب اس نے اسٹوڈیو کی پوشاک پہن لی تھی ۔ گھگھرے چولی میں وہ کتنی خوبصورت نظر آتی تھی ۔ رعب حسن کے مارے کندن نے نظر ہٹالی ۔ مگر وہ سیدھی اسی کی طرف آئی ۔

" اے ۔ چھوکرا ۔۔۔ " نازنین کی لفرقی آواز اس سے مخاطب ہوئی " میرا فون تو نہیں آیا تھا ؟ "

" جی ۔ جی ۔ جی ۔ " کندن اپنی خوش قسمتی سے دو چار ہو کر ایسا گڑبڑایا کہ ہکلانے لگا " آیا ۔ تو ۔ تھا ۔۔۔ "

" پھر تم نے کیا کہا ؟ "

" جی ۔ جی ۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا مگر وہ دفتر والوں نے منع کر دیا کہ نہیں بلا سکتے "

" گدھے کہیں کے " ۔ اور کندن نے دیکھا کہ وہ غصے سے

اپنا نچلا یاقوتی ہونٹ موتیوں جیسے دانتوں سے دبا رہی ہے۔ پھر وہ ادھر
ادھر دیکھ کر دھیمے سے بولی "اچھا دیکھو اب فون آئے تو تم خود اٹھا
لینا اور میرے لئے ہو تو مجھے اسٹوڈیو میں اشارہ کر دینا۔ چلانا مت سب
کے سامنے۔ سمجھے نا"

ابھی وہ یہ بات کر ہی رہی تھی کہ ایک بوڑھے گلے کے کھانسنے
کی آواز آئی۔ "یہ نازنین کی [illegible]" جو جھومتی جھامتی چلی آ رہی تھی۔ مگر اس کی
آنکھیں کمزور تھیں اور [illegible] سے قریب کی چیزوں کے کچھ سجھائی نہیں
دیتا تھا۔ نازنین نے کندن کو ایک التجا بھری نظروں سے دیکھا اور
غڑاپ سے سیٹھ جی کے کمرے میں۔ اس کمرے کا ایک دروازہ دوسری
طرف کھلتا تھا۔ عین اسٹوڈیو کے سامنے۔

بوڑھی [illegible] نے کندن کو اپنی دقیانوسی عینک کے شیشوں میں سے
گھور کر دیکھا۔

"کیوں رے نازنین تو ادھر نہیں آئی؟"

"نہیں بائی جی۔ وہ تو نہیں آئیں"

"نا جانے کہاں مر گئی" بڑبڑاتی ہوئی بڑھیا واپس چلی گئی اور
کندن نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بھی کتنا خوش قسمت تھا کہ مس نازنین
نے اسے اپنا ہمراز بنایا تھا۔ جان جائے پر اس راز کو وہ کسی پہ کبھی ظاہر
نہ کرے گا!

ابھی وہ اس انتظار میں تھا کہ شاید نازنین [illegible] کے لئے پھر فون آئے

کہ ایک ٹیکسی آئی اور اس میں سے عجیب ہئیت کذائی کا ایک نوجوان ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا لئے اترا۔ گہرے رنگ کی پتلون کھلے گلے کی قمیص۔ ننگے سر۔ موٹے موٹے گول شیشوں کی عینک۔ سر کے بال خشک بے ترتیب اور کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے۔ ٹیکسی والے کو ایک روپیہ دیا اور سات آنے واپس لے کر احتیاط سے جیب میں رکھے۔ ظاہر ہے کہ ٹیکسی کہیں قریب ہی سے لی تھی کہ میل بھر سے کم کا ہی کرایہ دینا پڑا ٹیکسی واپس چلی گئی اور نو وارد کندن کی طرف آیا۔

"کیوں بھئی سیٹھ صاحب ہیں اندر؟"

بمبئی کے کرخت ماحول میں اتنی شُستہ زبان سن کر کندن متعجب ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نو وارد شمالی ہندوستان کا رہنے والا ہے

"جی میں خود انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی تو نہیں آئے۔ مگر آنے والے ہی ہیں۔ بیٹھئے"

نو وارد کندن کے برابر بیٹھ گیا اور بولا "تب تو خواہ مخواہ ہی ٹیکسی پر پیسے برباد کئے"

زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ کندن خوب جانتا تھا کہ اسٹوڈیو میں نوکری تلاش کرنے والے دور سے ریل یا ٹرام یا بس سے، یا پیدل آ کر دادر اسٹیشن یا خداداد سرکل سے ٹیکسی لیا کرتے ہیں تاکہ سٹوڈیو والوں پر ذرا رعب پڑ جائے۔

"تو آپ بھی کام کے لئے آئے ہیں؟" اس نے پوچھا

"آیا نہیں ہوں بلایا گیا ہوں ... سیٹھ صاحب کا خط گیا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے بمبئی آکر ملے۔ سو میں چلا آرہا ہوں"

کندن نے غور سے نووارد کو دیکھا۔ "ہیرو" قسم کی شکل ہرگز نہیں تھی اور نہ وضع قطع "ایکسٹرانہ" تھی۔ اس نے سوچا "شاید کوئی کیریکٹر ایکٹر ہو"

"آپ کو میں نے کسی فلم میں دیکھا نہیں ابھی تک، شاید ابھی آپ کی فلم نکلی نہیں ..."

"میں تو آج پہلی بار کسی اسٹوڈیو کے دروازے میں داخل ہوا ہوں"

"تو آپ کسی پکچر میں رول کے لئے ..."

"نہیں، نہیں، بھئی میں ایکٹر نہیں ہوں۔ میں کہانیاں لکھتا ہوں"

"کون کون سی کہانیاں فلم ہوئی ہیں آپ کی؟"

"کوئی بھی نہیں، میری کہانیاں اب تک چھپتی رہی ہیں فلمائی نہیں گئیں"

"آپ کا نام؟"

"میرا نام تو مادھو سنگھ ہے، مگر میں نرمل کے نام سے لکھتا ہوں"

نرمل؟ نرمل؟ ... نرمل!

تو یہی اردو اور ہندی کا مشہور مصنف نرمل تھا۔ جس کے افسانوں
ناولوں اور ریڈیو ڈراموں کی تمام ملک میں دھوم تھی، جس کے رومانی
انداز بیان نے ہزاروں لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر دی تھیں،
اور ہزاروں لڑکیوں کی راتوں کی نیندیں اچاٹ کر دی تھیں۔ کندن خود
کب سے نرمل کے مداحوں اور نادیدہ پرستاروں میں سے تھا۔

نرمل؟ مگر نرمل تو ایک باغی ادیب تھا۔ اپنی انقلابی تحریروں
کی وجہ سے دو بار جیل جا چکا تھا۔ اپنے ناول "جنت میں جہنم" کی وجہ
سے ریاست کشمیر میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کی کئی
کتابیں ضبط ہو چکی تھیں اور ان میں سے دو ایک کو تو قومی حکومت
بھی خطرناک سمجھتی تھی کیونکہ ان میں مزدوروں اور کسانوں کو انقلاب
کی ترغیب دلائی گئی تھی۔

نرمل؟ بھلا نرمل کا گریٹ آرٹ پکچرز کے اسٹوڈیو میں کیا کام؟
کندن کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ "ہائے جانی" اور "ظالم
جوانی" جیسی فلمیں بنانے والے سیٹھ جی نرمل کی کسی کہانی کو بھی فلمانے
کے لئے تیار ہو جائیں۔

"تو، نرمل جی، آپ فلم کے لئے کہانی لکھیں گے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ لکھوں گا نہیں بلکہ لکھ چکا ہوں۔ وہی
تو آج سیٹھ جی کو سنانے آیا ہوں"

"کیا نام ہے آپ کی کہانی کا؟"

"سرخ سویرا؟"

"سرخ سویرا؟ بڑا اچھا نام ہے! ... ایک بات پوچھوں، نرمل جی اگر آپ بُرا نہ مانیں؟"

"ہاں، ہاں۔ پوچھو، بھئی"

"اس کہانی میں میرے جیسے لڑکے کے لئے کوئی کام نکل سکتا ہے؟"

نرمل نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھیں کندن کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اور کندن کو ایسا معلوم ہوا کہ باغی ادیب کی نظر اس کے دل اور دماغ کے کونے کونے کو ٹٹول رہی ہے۔ مڈل کے امتحان میں جب وہ شریک ہوا تھا تب بھی اُسے اتنی گھبراہٹ نہ ہوئی تھی۔

"کسی فلم میں کام کیا ہے؟" نرمل نے دفعتاً سوال کیا۔

"جی ... ابھی ... تک ... تو کسی نے چانس نہیں دیا"

کندن نے ڈرتے ڈرتے اقرار کیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اگر کسی اور فلم میں کام نہیں کیا تو میری کہانی میں ضرور کام کر سکتے ہو ... مجھے کاٹھ کے پتلے اور رنگین تتلیاں نہیں انسان چاہئیں انسان"

"تو پھر مجھے کون سا پارٹ مل جائے گا؟"

اور وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا۔ کاش مجھے کسی نوکر کا نہیں بلکہ ہیرو کے دوست کا پارٹ مل جائے!

مگر نرمل نے جو جواب دیا اس کے لئے کندن بالکل تیار نہ تھا۔

"میرے خیال میں میری کہانی کے ہیرو کے لئے تمھارے جیسا ہی لڑکا چاہیئے"

مسرت کی ایک سنسناہٹ بھری لہر کندن کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔ کیا زندگی کے سارے خواب ایک ہی دن میں سچے ہو سکتے ہیں؟ پہلے مس نازنین کی میٹھی میٹھی باتیں اور اب نرمل جیسے مشہور ادیب کی یہ نوازش!

ابھی وہ اپنے نئے محسن اور کرمفرما کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پایا تھا کہ سیٹھ جی کی کار کا ہارن سنائی دیا اور وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کی ساری امیدوں کا دارومدار سیٹھ جی کی نظر عنایت پر ہی تھا۔

سفید ریشمی کوٹ (جس میں سونے اور ہیرے کے بٹن لگے ہوئے تھے) سفید دھوتی اور سیاہ ٹوپی پہنے سیٹھ جی کار سے اترے برامدے کی سیڑھیوں پر پان کی پیک تھوکی۔ اور بغیر کندن یا نرمل کی طرف دیکھے سیدھا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دفتر سے دو تین کلرک اور چپراسی فائلیں، خطوط کے پلندے وغیرہ لئے دوڑے سیٹھ جی کی ایک گونجتی ہوئی ڈکار سنائی دی اور اس کے بعد ٹیلیفون کی پرخی گھمانے کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ سیٹھ جی نے اپنے ذاتی ٹیلیفون پر اسٹاک بروکر سے سٹے کی بات چیت شروع کر دی۔ کوئی کوئی لفظ باہر بھی سنائی دیتا تھا۔ ... بمبئی منڈی ... خرید ... بیچو ... ایک سو انیس ... نیویارک کاٹن ... کورا Corner

کر دو کوہ ...."

نرمل نے کندن کی طرف دیکھا اور کندن نے نرمل کی طرف۔

باغی ادیب نے "سرخ سویرا" کا پلندا جو اپنے تھیلے سے آدھا باہر نکال لیا تھا پھر اندر ٹھونس دیا۔

ایک چپراسی باہر آیا تو کندن نے اُسے روک کر کہا "دیکھو یہ نرمل جی بڑے لیکھک ہیں، سیٹھ جی کے بلانے سے آئے ہیں، ان کا نام تو اندر پہنچاؤ"

چپراسی نے نرمل پر اوپر سے نیچے تک پریشان بالوں سے لے کر پیوند لگے ہوئے چپلوں تک اس طرح حقارت سے نظر ڈالی جیسے کہہ رہا ہو۔

"بہت دیکھے ہیں ایسے ایسے منشی!"

"کارڈ ہے تمہارے پاس؟"

"کارڈ تو نہیں ...."

"ہنہہ! .... یہ لو، نام لکھو"

نرمل نے پرچی پر نام لکھ کر چپراسی کو دیا اور پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ کے بعد چپراسی آیا اور اس بار کسی قدر کم بدتمیزی سے بولا۔

"بلاتے ہیں سیٹھ جی"

نرمل اندر گیا تو چپراسی نے کندن سے پوچھا

"تم کو کیا چاہئے؟"

"میں تو اسٹوڈیو ہی کا آدمی ہوں بھئی۔ لائٹ ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتا ہوں۔ بات سیٹھ جی نے سیٹ پر کہا تھا سویرے ہمیں آفس میں ملو۔"

"ہنہ! ۔ لائٹ قلی!"، چپراسی نے اس طرح کہا جیسے کسی مکوڑے کو ایک بھاری جوتے تلے دبا کر مسل دیا جائے اور بیڑی سلگاتا ہوا ہوٹل کی طرف چلدیا۔

پر کندن نے اس کی پرواہ نہ کی۔ بلکہ یہ سوچ کر مسکرایا: "کل اسی چپراسی کو مجھے جھک کر سلام کرنا پڑے گا۔ اس بیوقوف کو نہیں معلوم کہ میں اس کمپنی کی اگلی فلم کا ہیرو ہوں ہیرو!"

چوتھا ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کو چھوڑ کر ایک سنہری تتلی کی طرف بھاگتا ہے)

اندر کمرے میں سیٹھ جی نرل سے سوال جواب کر رہے تھے۔

"ہاں تو تمہاری اسٹوری کا کیا نام ہے، منشی جی؟"

"دیکھئے میں منشی نہیں ہوں ...."

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ اپنے ہاں بڑا بڑا منشی کام کر چکا ہے۔ منشی کھنچ، منشی مستانہ، منشی بیرمی، منشی پردیسی ... ... ہاں تو کیا نام ہے اسٹوری کا؟"

"سُرخ سویرا"

"سرکھ بسیرا؟"

"جی ہاں سرخ سویرا۔ مطلب ہے کہ آزادی اور انقلاب کی صبح نو ... ..."

سیٹھ صاحب کچھ نہیں سمجھے۔ بات کاٹ کر بولے: "نا، نا۔ یہ نہیں چلے گا۔ سرکھ بسیرا یہ تو ریڈ سگنل جیسا نام ہے۔ کوئی سمجھے گا ہم نے اسٹنٹ پکچر بنایا ہے۔"

"سیٹھ صاحب، یہ دوسری قسم کا ریڈ سگنل ہے۔ یہ سرخی خون کی سرخی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کا خون ... خونی شفق۔"

"خونی عاشق!" سیٹھ صاحب چہک کر بولے: "یہ فلم تو ہم دس برس ہوئے بنا چکا ہے۔ دیکھیو، منشی جی ... ..."

"میں نے آپ سے کہا نہیں کہ میں منشی نہیں ... ..."

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ وہ منشی کھنجر بھی یہی بولتا تھا۔ ہاں تو تم نے نیو تھیئیٹر کا فلم 'ہمراہی' دیکھا ہے۔ پہلے یہ فلم بنگالی میں اتارا تھا۔ نیا ہیرو۔ نیا ہیروئن۔ نہ گانا نہ ڈانس۔ سب بولتا دو چار ویک بھی چلے تو بہت ہے۔ پر جانتے ہو کلکتے میں کتنا چلا۔ سال بھر۔ پورے سال بھر۔ ابھی بومبے میں ہندستانی میں چلتا ہے، ہم بھی دیکھنے گیا۔ بالکل بنڈل ہے ہیرو ایک دم کالا کلوٹا دیہاتی دکھتا ہے۔ بالکل رومانٹک نہیں۔ ہیروئن گھوڑی جیسی دکھتی ہے۔ اس سے تو اپنی تاتا رانی زیادہ سندر ہے۔ گانا اپنے مدھوک بابو جیسا ایک بھی نہیں پھر بھی کیا رش لے رہا ہے۔ جب

دیکھو، ہاؤس فل، ... ناجانے پبلک کیوں اتنا تالی مارتا ہے، ہمارا ڈائرکٹر باسو بولتا ہے اس میں سیٹھ لوگوں اور پیسے والوں کو گالی دی ہے سو پبلک تالی مارتا ہے۔ سو اپنے کو بھی ایسی ہی اسٹوری مانگتا۔ ہم بھی سیٹھ ہے پر تم سیٹھ لوگوں کو جتنی چاہے گالی دو۔ ہاں دس گانے مانگتا اور پکچر کم سے کم سلور جوبلی ہِٹ ہونا چاہئے"

سیٹھ صاحب کی تقریر سن کر بیچارہ افسانہ نگار لاجواب بلکہ مبہوت ہو چکا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بولا "دیکھئے۔ میں کہانی لکھنے وقت کسی کی نقل نہیں کرتا۔ تمراہی، میں نے دیکھا ہے۔ اچھا خاصا قلم ہے مگر نفسیاتی لحاظ سے اس میں چند بنیادی کمزوریاں ... "

"ہوگا۔ ہوگا" سیٹھ صاحب نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا "تم اپنی اسٹوری ہی لکھو۔ ہم سنتا تم سوشلسٹ لیکھک ہو۔ سیٹھ لوگوں کو ایک دم گالی دیتے ہو ... "

"میں گالی نہیں دیتا ہوں، سیٹھ صاحب۔ میں سماج کی حقیقت کو بے نقاب کرتا ہوں ... "

"اور دیکھو اتنا کٹھن ڈائلاگ نہیں چلے گا۔ اپنے کو ایسا ڈائلاگ چاہئے جو کشمیر سے لے کر مدراس تک سب ایک دم سمجھ جائیں"

"پہلے کہانی تو سن لیجئے، پھر ڈائلاگ کی بات کیجئے گا"

سیٹھ صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا اور کھڑے ہو گئے، "دیکھو آج تو اپنے کو ٹائم نہیں ہے۔ جرا شیر بازار جاتا ہے۔ پھر کسی دن سنے گا، آج

تم ڈائرکٹر باسو کو اسٹوری سناؤ۔ جیسا وہ بولے ویسا چینج کر کے پھر ہمیں سنانا۔" "بیسو بیسو نتی بیسو"۔ بیساختہ گجراتی بولتے ہوئے سیٹھ صاحب کمرے سے باہر نکل آئے۔

کندن جو اسی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا سیٹھ صاحب کی طرف لپکا۔

"سیٹھ جی، نمستے"

"نمستے، نمستے۔ کیا ہے؟"

"آپ نے بلایا تھا نا۔ رات سیٹ پر آپ بولے سویرے ہمیں ملو"

"اچھا اچھا۔ تم وہ لائٹ والا چھوکرا ہے۔ تم اچھا کام کرتا ہے..."

کندن کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

"وہ لائٹ مین کا کام اچھا نہیں ہے۔ تم کو کوئی دوسرا اچھا کام دے گا"

کندن کو ہیرو بننے کا خواب پورا ہوتا نظر آیا۔ اور پھر ایک لمحے میں امید و امنگ کے سب سپنے مٹی میں مل گئے۔

"آج سے تم یہاں کام کرو۔ آفس کا ایک چپراسی ہے ادھر، میرا بیٹے کو ایک اپنا پرائیویٹ چپراسی چاہیے ..." اور پھر جاتے جاتے "ہاں، دیکھو۔ ڈائرکٹر باسو کو بولو وہ لیکھک نرمل جس کو ہم نے بلایا تھا ادھر بیٹھا ہے۔ اس کو سٹوری سنا لیں۔" یہ کہہ کر اور موٹر میں بیٹھ کر سیٹھ جی چل دیئے۔

لائٹ مین سے چپراسی! ... تو یہ ہوئی اس کی ترقی!...

پھر بھی ڈائرکٹر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں کندن نے سوچا کم سے کم روز سیٹھ اور دوسرے ڈائرکٹروں کے سامنے آنے کا موقعہ تو ملے گا۔ شاید کسی دن کسی کی نظر پڑ جائے اور وہ اپنے فلم کے کسی رول کے لئے منتخب کرلے۔

ڈائرکٹر باسو آرام کرسی پر لیٹے ایک امریکن فلمی میگزین پڑھ رہے تھے۔ ان کو اسٹوڈیو میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور قابل آدمی سمجھا جاتا تھا۔ بی۔اے میں پڑھتے تھے جب گھر سے بھاگ کر فلم لائن میں آئے تھے۔ امریکن اور انگریزی فلمیں باقاعدگی سے دیکھتے تھے اور "ربیکا" یا "گون وِد دی ونڈ" جیسے ناول بھی پڑھ لیتے تھے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے، ٹیگور یا سرت چندر چیٹرجی کی ایک آدھ کتاب ساتھ رکھتے تھے تاکہ ان کی ادب شناسی کا سکہ سب پر بیٹھ جائے۔ ہمیشہ سلک کا کرتا اور ململ کی دھوتی اور اوپر ایک کشمیری شال میں ملبوس نظر آتے تھے تاکہ لمبے بالوں کے ساتھ اس لباس سے بھی فنکارانہ ماحول بنا رہے۔

نرمل نے سیٹھ صاحب کا پیغام ڈائرکٹر باسو کو پہنچا دیا، اور پھر ایک پیالی چائے پینے کے لئے ہوٹل کی طرف چلا۔ ہوٹل کے سامنے ایک درخت کے نیچے گول چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر اکثر اکسٹرا لڑکیاں بیٹھی رہتی تھیں۔ نرمل عام طور سے ادھر سے کترا کر ہی نکل جاتا تھا کیونکہ اس نے سنا تھا کہ یہ لڑکیاں بڑی آوارہ اور بدمعاش ہوتی ہیں، فلموں میں کام ملنے کے عوض اپنا جسم فروخت کرتی پھرتی ہیں اور کتنے ہی جنسی امراض کا شکار

ہوتی ہیں اس کے علاوہ وہ خود ہیرو بننے اور شکنتلا یا نازنین جیسی ہیروئن سے
عشق کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ اسسٹنٹ کیمرہ مینوں اور اسسٹنٹ
ڈائرکٹروں کی طرح ایکسٹرا لڑکیوں کے چکر میں پڑ کر اپنی آئندہ ترقی کو کیوں
خطرے میں ڈالنے لگا۔

آج ہوٹل میں بھیڑ اتنی تھی کہ بیٹھنے کو ایک کرسی بھی نہ تھی، اور جب
سابق لائٹ قلی دھال چپراسی نرمل کے لئے بھلا کون کرسی خالی کرتا۔ چنانچہ ہو کر
وہ باہر نکل آیا اور سوچا چند منٹ انتظار کرنے کے بعد جب کوئی جگہ خالی
ہو گی تو پھر اندر چلا جائے گا۔ درخت کے نیچے حسب معمول چند ایکسٹرا
لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ نرمل نے جان بوجھ کر ادھر پیٹھ کر لی اور سیٹھ جی
کے دفتر کی چھت پر بیٹھے ہوئے کبوتروں کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ پر اس
کا جی چاہتا تھا کہ کسی بہانے سے ایک بار ادھر نگاہ غلط انداز ڈال
لے شاید اتفاق سے کوئی اچھا چہرہ ہی نظر آ جائے۔ کان اس کے ادھر
ہی لگے رہے۔

دو لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں

"تو بڑے ٹاکیز میں کام نہیں چلا؟" ... یہ آواز چنچل اور شوخ
اور پنجابی تھی

"نہیں۔ اگلے ہفتے پھر بلایا ہے۔" ... یہ آواز دھیمی
اور مترنم تھی

"تو بس یہ ہے کہ تم دادا گنجا کے ساتھ گئیں اور تمہارا کام نہ بنا۔"

"جب ان کو ضرورت ہی نہ ہو تو وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"یہ تو نہ کہو۔ جس لڑکی سے اس کا تعلق ہو جائے اس کے لئے جان لٹا دیتا ہے"

"میرا اس کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ یہ الفاظ بھی اس نامعلوم لڑکی کی زبان سے جھجکتے ہوئے نکلے اور نہ جانے کیوں نرمل کو اس آواز میں وہی معصومیت، وہی حیا سنائی دی جو سویرے اس لڑکی کے چہرے پر دکھائی دی تھی جو دادا گنجا کی موٹر کے پاس کھڑی تھی۔

چنچل اور شوخ ہنس کر بولی "بہن ابھی نئی ہو۔ جبھی ایسی باتیں کرتی ہو"

پھر تھوڑی دیر خاموشی

"کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟"

"کون جانتا ہے۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور ڈائریکٹر صاحب کو اکسٹرا لڑکیوں کا چناؤ کرنے کی فرصت نہیں ملتی"

"بھوک لگی ہے۔ بس صبح ایک پیالی چائے پی تھی"

"مجھے خود۔ پر پتہ نہیں پیسے بھی ہیں یا نہیں۔ یہاں تو ایک توس بھی دو آنے کا ملتا ہے"

پھر بٹوؤں سے پیسے نکالنے اور گننے کی آواز۔

"دس آنے ہیں، چار آنے واپسی کے لئے چاہئیں چھ آنے میں کیا ملے گا" اور اس بار نرمل نے محسوس کیا کہ چنچل اور شوخ آواز اتنی

چنچل اور شوخ نہ رہی تھی۔

"میرے پاس تو بس چھ آنے ہیں۔ ٹرام میں بھی گئی تو گھر پہنچنے کے لئے چھ پیسے چاہئیں"

"تو کوئی بات نہیں۔ ایک ایک آملیٹ کھا لیتے ہیں" ..

اور پھر آواز کا نشانہ نرمل کی طرف۔

"اے مسٹر!"

اب تو نرمل کو مڑ کر دیکھنا ہی پڑا۔ چنچل اور شوخ آواز والی جس نے اسے پکارا تھا خاصی قبول صورت مگر کسی قدر چھوٹی آنکھوں والی لڑکی۔ اس نے میک اپ، بالوں کے سنگھار، ساڑھی باندھنے کے انداز اور گردن کے خم سے شانتا رن سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ساتھ والی وہی لڑکی تھی جسے نرمل نے صبح اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔ قریب سے وہ اور بھی بھلی نظر آئی۔ اور باوجودیکہ نہ اس کے چہرے پر پینٹ یا پوڈر تھا نہ کوئی زیور، ساڑھی بھی معمولی سوتی گھر کی دھلی ہوئی۔ پھر بھی اس کا معصوم اور قدرتی حسن نہایت دلکش تھا۔

نرمل کو یاد آیا کہ اکثر لڑکیاں نوجوانوں کو پھانسنے کے نت نئے طریقے اختیار کرتی ہیں۔ اس لئے اس نے کافی درشتی سے جواب دیا "کیوں کیا ہے؟"

لفظ تو ...ں نے ...ا ... منہ بنا کر بہ ... ابھی سرکار استنے بگ... کیوں ... آپ ... ہم ... ہوٹل میں آملیٹ

کتنے کا ملتا ہے "

"میں کوئی ہوٹل کا چھوکرا ہوں؟" نرمل نے اپنی سفید قمیص اور پتلون کو جتاتے ہوئے سختی سے کہا - "اندر کیا [illegible] پانچ بارہ آنے کا ملتا ہے" اور اس پر معصوم حسن کے چہرے پر پہلی ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی -

نرمل نے پھر منہ پھیر لیا - دونوں لڑکیوں میں آملیٹ کے اقتضاء کی مسئلے پر بات چیت شروع ہو گئی - طے یہ ہوا کہ دونوں مل کر ایک آملیٹ ہی منگا کر کھا لیں اور کمی پوری کرنے کے لئے دونوں بس کے بجائے ٹرام میں گھر واپس جائیں - ہوٹل کے چھوکرے کو آرڈر دے دیا گیا -

"کیوں بہن تمھارا نام کیا ہے؟" شوخ اور چنچل نے پوچھا

"اندرا - اور تمھارا؟"

"ماں باپ تو کمو کمو پکارتے تھے پر اب میں کومیتا کمار ی کہلاتی ہوں "

"اندرا! " اچھا شریفانہ نام ہے " کندن نے سوچا " اچھی بھلی لڑکی معلوم ہوتی ہے - اس سے ملاقات بڑھائی جائے تو کیا ڈر ہے [illegible] والے تو یہی کہیں گے کہ ایک اکسٹرا لڑکی کو پھانس لیا . . . . ،

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سیٹھ کے کمرے کی طرف سے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے کی آواز آئی اور کندن بے تحاشا [illegible] کا فون ہوگا -

مگر اس کا قیاس غلط نکلا۔ یہ تو مگن لال ڈریس والا کی دوکان سے پروڈکشن منیجر کے لئے پیغام آیا تھا کہ دس ناچنے والیوں کے گھگھرے سل کر تیار ہو گئے ہیں مگر چولیاں کیسے سل سکتی ہیں جب تک سب ایکسٹرا لڑکیاں اپنا ناپ دینے خود نہ آئیں۔

کندن نے یہ پیغام پروڈکشن منیجر کو پہنچا دیا جو بیٹھا ہوا لڑکیوں کی تصویروں کے گڈے سے تاش کی طرح کھیل رہا تھا۔ وہ بولا "لڑکیوں کو ناپ دینے کے لئے کہاں سے بھیجوں جب ابھی تک اُن کا چناؤ ہی نہیں ہوا۔ آج ڈھنگ کی صورت شکل لڑکی کہاں ملتی ہے۔ ارے ڈانس کے واسطے بدن بھی تو چاہئے۔ یہاں تو جسے دیکھو، سوکھا، چپا ہوا آم یا موٹی پھوپس، کہہ دو اپنی مرضی سے جس ناپ کی چاہے بنا دیں۔ بعد میں ٹھیک کروا لیں گے۔ اور کچھ نہیں تو روئی بھر دیں گے"

کندن نے جاتے جاتے پروڈکشن منیجر کے کان میں یہ بات ڈال دی "اچھی صورت شکل کی لڑکیاں چاہئیں تو دونوں آپ کے دفتر کے باہر ہی بیٹھی ہیں"

مگن لال ڈریس والا کو جواب دے کر فون بند ہی کیا تھا کہ گھنٹی پھر بجنے لگی۔

"گریٹ آرٹ پکچرز۔ کون چاہئے آپ کو؟"

"دیکھو مس نازمیں سے کہہ دو کہ ان کی سہیلی کملا نے انھیں شوٹنگ کے بعد پانچ بجے چائے پر بلایا ہے۔ تاج محل ہوٹل میں۔ بھول نہ جائیں"

"بہت اچھا۔ میں ابھی کہہ دیتا ہوں"

"اور سنو۔ یہ بات نرداان سے علیحدگی میں کہنا۔ اُن کی ماں یا نانی کے سامنے نہیں"

اس سے پہلے کہ کندن سوال کرسکتا کہ مس نازنین کی سہیلی کملا چھپا کر دعوت کیوں کر رہی تھی، فون کٹ گیا۔ اور وہ دل ہی دل میں اس مسئلے پر غور کرتا ہوا اسٹوڈیو کی طرف گیا یہاں ڈائرکٹر سنڈا کے فلم "تتلی" کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔

"ریہرسل!" ڈائرکٹر رام پرشاد ہنڈا شمال مغربی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اس کی آواز میں پٹھانی قسم کا کرخت رعب داب تھا۔

نازنین کا کلوزاپ لیا جانے والا تھا۔ وہ درجنوں روشنیوں کے جھرمٹ میں کھڑی کیمرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہی تھی "میں تمہارے پریم کے لئے دنیا کی ہر چیز بلیدان کرسکتی ہوں، منگو۔ دھن دولت۔ ماں باپ گھربار"

اور نازنین کی نانی چنیا بائی دور کرسی پر بیٹھی پان چباتے ہوئے منشی پردیسی سے کہہ رہی تھیں (جو فلمی مکالمہ نویس بننے سے پہلے درزی کا کام کرتا تھا) "واہ منشی جی۔ کیا ڈائلاگ لکھو ہو۔ بس طبیعت پھڑک جاوے ہے سن کے"

"اوکے فار ساونڈ"

"میک اپ"

نازنین کا میک اپ درست ہو رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ کندن اس سے کچھ کہنے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے میک اپ والے سے کہا، ذرا ڈریسنگ روم سے میرا بیگ تو اٹھا لانا۔" حالانکہ بیگ تو وہیں اسٹوڈیو میں اس کی ماں کے پاس تھا۔ جیسے ہی میک اپ والا ملا نازنین نے ہلکی آواز میں کندن سے پوچھا "کیوں کوئی فون آیا؟"

"جی ہاں۔ آپ کی سہیلی کملا نے چھ بجے آپ کو چائے پر بلایا ہے۔ تاج محل ہوٹل میں۔ تاکید کی ہے کہ بھول نہ جائیں۔"

"چھ بجے!" اور کندن نے نازنین کے چہرے پر کچھ ایسے آثار دیکھے جیسے وہ دل ہی دل میں کوئی حساب لگا رہی ہو یا شاید کوئی فیصلہ کر رہی ہو۔ پھر وہ بولی "شاباش۔ کسی اور سے مت ذکر کرنا۔"

ابھی کندن جواب میں کچھ کہنے والا ہی تھا کہ اس کی جان بھی چلی جائے تو مس نازنین کا کوئی راز اس کی زبان سے نہیں نکل سکتا کہ میک اپ والا واپس آگیا "ابھی وہاں تو آپ کا بیگ نہیں ملا ... ..." کندن واپس چلا آیا۔

سیٹھ صاحب کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو نرمل اپنی کہانی پڑھ رہا تھا اور ڈائرکٹر یا سو سرپرستانہ انداز میں "ہاں ــــ ہوں ــــ یس ــــ ناٹ بیڈ" وغیرہ کہتے جا رہے تھے۔

نرمل ایک سین سنا رہا تھا۔

"کلو مفلس ہے، مگر وہ بھیک نہیں مانگتا۔ وہ چوری بھی نہیں کرتا، وہ اپنا حق مانگتا ہے۔ مزدوروں کو جمع کر کے وہ کہتا ہے "بھائیو!

ہم اپنے خون پسینے سے ... "

وہ اتنا ہی سن پایا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بجی اور وہ اُدھر بھاگا۔ یہ وہی مس نازنین کی مردانہ آواز والی "سہیلی" کملا تھی۔ "کیوں مس نازنین سے کہہ دیا نا؟"

کندن نے اطمینان دلایا کہ پیغام پہنچا دیا گیا ہے "کسی اور کے سامنے تو نہیں کہا؟" ۔ نہ جانے یہ مردانہ سہیلی نازنین کی دعوت اتنے خفیہ طریقے سے کیوں کر رہی تھی! خیر کندن کو اس سے کیا غرض۔ اُس نے پھر یقین دلایا "نہیں جی میں ایسا بے وقوف تھوڑا ہی ہوں۔ بالکل اکیلے میں کہا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں"

پھر وہ مردانہ کملا کا جواب سن کر دنگ رہ گیا "تو پھر جیو میری جان!" اور فون کا سلسلہ کٹ گیا۔

پروڈکشن منیجر کے کمرے سے ایک نرم سی، پہچانی ہوئی سی آواز آئی۔ کندن نے اُدھر جھانکا تو دیکھا کہ وہی معصوم اور مغموم آنکھوں والی اندرا ہے وہ کہہ رہی تھی "آپ سوچ لیجئے۔ کام کرنے کو میں تیار ہوں۔ مگر مجھے تجربہ بالکل نہیں ہے اور ناچنا تو مجھے ذرا بھی نہیں آتا ... "

اور پروڈکشن منیجر کہہ رہا تھا "آپ کیا بات کرتی ہیں مس اندرا۔ آپ تو بہت جلد ہیروئن ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے اگلی ہی پکچر میں۔ صرف ... "

اور یہ کہہ کر وہ ٹھیرا معنی خیز انداز سے اندرا کی طرف دیکھا اور پھر بولا "صرف ذرا محنت کی ضرورت ہوگی"

" محنت تو میں جتنی کہیے اُتنی کرنے کو تیار ہوں "۔ وہ "محنت" کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بولی " چاہے دس بار ریہرسل کرا لیجئے ۔ ڈائیلاگ تو میں چند منٹ میں یاد کرکے سنا سکتی ہوں ..."

پروڈکشن منیجر نے نہایت تھکی ہوئی آواز میں کہا " اچھا تو جاؤ ۔ کل ملنا "۔ اور جب اندرا نمسکار کرکے جانے لگی " ابھی بہت ناتجربہ کار ہو تم ! "

اندرا باہر نکلی تو کندن سے تقریباً ٹکر ہوتے ہوتے بچی ۔ شاید اُسے وہ آملیٹ والی بات اور کندن کی بوکھلاہٹ یاد آ گئی ۔ اور وہ مسکرا دی ۔

کندن کو بات کرنے کی ہمت ہوئی " کہئے کنٹراکٹ ہو گیا آپ کا ؟ "

" نہیں ابھی کنٹراکٹ کی تو کوئی بات نہیں ہوئی مگر پروڈکشن منیجر صاحب نے امید بہت دلائی ہے ۔ کہتے ہیں شاید اگلی پکچر میں مجھے ہیروئن کا کام مل جائے "

اور پہلی بار کندن نے اُن غمگین سی آنکھوں میں امید کی جھلک دیکھی ۔ اور اس کا جی نہ چاہا کہ یہ کہہ کر کہ پروڈکشن منیجر تو یہی بات تقریباً ہر روز کسی نہ کسی اکسٹرا لڑکی کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے اس سے کہا کرتا ہے ۔ امید کی جھلک کو بھی ختم کر دے ۔ اس نے صرف اتنا کہا " بھگوان کرے ایسا ہی ہو "

اسٹوڈیو کی گھنٹی دیر تک بجی ۔ کام ختم ۔ چھٹی ۔ اب نازنین نکلے گی شاید اس سے کچھ بات کرے ۔ کندن اکسٹرا لڑکی کو چھوڑ ہیروئن کی زبان سے دو لفظ سننے کی آرزو میں اسٹوڈیو کی طرف بھاگا ۔ نازنین کی ماں اور نانی ڈائرکٹر سنہا کو گھیرے کھڑی تھیں اور " مونڈی کاٹے " سیٹھ منیجر کی حجامت اب تک ہو رہی تھی ۔ نازنین اپنا بیگ ہاتھ میں لٹکائے ڈریسنگ روم میں داخل ہوا ہی چاہتی

تھی کہ کندن پہنچ گیا۔

"کوئی اور کام تو نہیں ہے آپ کو؟" اُس نے ہکلا کر پوچھا۔ کاش اس وقت وہ کہے کہ آسمان کے تارے توڑ لاؤ! مگر خیر اگر وہ یہ بھی کہے کہ میرے جوتے پر سے گرد صاف کرو تو وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتا۔

"تو بڑا سمجھ دار چھوکرا ہے"، نازنین نے کہا۔ اور گو کندن اپنے آپ کو "چھوکرا" نہیں پورا آدمی سمجھتا تھا وہ اپنی یہ تعریف سن کر پھولا نہ سمایا۔ اب اسے یقین ہو چلا کہ نازنین اُسے اپنا دوست اور ہمراز سمجھتی ہے۔

مگر اگلے لمحے وہ آرزوؤں کے آسمان سے حقیقت کی زمین پر آ رہا۔ دھماکے کے ساتھ۔ بلکہ جھنکار کے ساتھ۔ اس چاندی کے روپے کی جھنکار کے ساتھ جو نازنین نے اس کی طرف ایسے پھینکا۔ جیسے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینکتے ہیں۔

ایک کار آمد قلی کو معقول انعام دے کر وہ اندر چلی گئی۔ اور کندن ——— لاجواب اور گونگا ہو کر ——— کئی منٹ تک زمین پر پڑے ہوئے اس چاندی کے روپے کو دیکھتا رہا جس پر بادشاہ کا چہرہ گویا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

پانچواں ریل

(جس میں ہیروئن ہیرو کو اپنے کاشانۂ عشرت میں بلاتی ہے)

اگلے دن کندن اسٹوڈیو پہنچا تو دو گرماگرم خبریں ملیں۔ نرمل کمار کی کہانی "سرخ سویرا" پانچ ہزار میں خریدی گئی تھی اور اب وہ ڈائرکٹر باسو کے ساتھ مل کر سینیریو اور مکالمہ لکھنے والا تھا۔ اب تو شاید سچ مچ کندن کو ہیرو بننے کا موقعہ مل جائے!۔ مگر دوسری خبر اس سے کہیں زیادہ سنسنی خیز تھی۔

نازنین کی ماں نے سیٹھ جی کو فون کیا تھا۔ سیٹھ جی نے گھر میں واویلا مچایا تھا۔ سیٹھ جی کے ڈرائیور نے پروڈکشن منیجر کو خبر پہنچائی تھی۔ پروڈکشن منیجر نے ڈائرکٹر ہنڈا سے کہا تھا کہ آج اس وجہ سے شوٹنگ نہیں ہوگی۔ ڈائرکٹر ہنڈا

نے اپنے دو اسسٹنٹ ڈائرکٹروں رام اور چوپڑا سے کہا تھا کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ چوپڑا نے میک اپ والے کو رازدار بنایا تھا۔ میک اپ والے نے ایک ایکسٹرا لڑکی کو جس سے اس کی آشنائی تھی۔ اس لڑکی نے چار دوسری ایکسٹرا لڑکیوں کے کانوں میں یہ بات گھس پھسائی تھی۔ غرض چند ہی گھنٹے میں نہ صرف گریٹ آرٹ پکچرز بلکہ رنجیت، سپریم، شری ساونڈ اور واور کے ہر اسٹوڈیو میں یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ نازنین بھاگ گئی ہے۔

نازنین بھاگ گئی ہے!

نازنین بھاگ گئی ہے!!

مگر کس کے ساتھ؟ کسی کا بیان تھا کہ حیدرآباد کے کسی جاگیردار کے بیٹے کے ساتھ۔ کسی کا کہنا تھا، اپنے ڈرائیور کے ساتھ، کوئی ایک مشہور فلمی ہیرو کا نام لیتا تھا۔ کوئی ایک مقامی مسلم لیگ لیڈر کو ذمے دار ٹھیراتا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ تمام اسٹوڈیو میں کھلبلی مچی ہوئی تھی گو دبی ہوئی آوازیں۔

مردانہ آواز والی سہیلی کملا "تاج محل ہوٹل۔ شام کے چھ بجے، اُف!" اس نے اپنے ہاتھ سے پیر پر کلھاڑی ماری تھی۔ اور کندن کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے ساتھ دغا کی گئی ہو۔ اس کے جذبات کو ٹھیس ... نہیں نہیں کیچڑ ... میں مسل دیا گیا ہو۔ جیسے ... جیسے ہیروئن ہیرو کو چھوڑ کر بدمعاش ولین کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ "اُف بے وفا دنیا! اُف دغا باز عورت!!" ... وغیرہ وغیرہ تمام فلمی مکالمے اس کے دماغ میں آتے رہے۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد اس نے سوچا ممکن ہے اس کے ڈوانی فلم کی

ہیروئن نازنین نہ ہو کوئی اور ہو اور نازنین صرف "سائڈ ہیروئن" یا ممکن ہے بس ایکسٹرا ہی ہو۔ تو پھر اس کی ہیروئن کون ہے؟

"میں نے کہا نمستے کندن جی"

یہ اندرا تھی۔ وہی خاموش اور حیادار آنکھوں والی اندرا۔ نہیں نہیں یہ گھر کی دھلی ہوئی سوتی ساڑھی پہننے والی ایکسٹرا لڑکی کندن کمار دھونے والے فلم اسٹار کی ہیروئن کیسے ہو سکتی ہے؟ اس نے جواب میں سوکھا سا "نمستے جی نمستے" کہہ کر ٹالنا چاہا۔

"کہیے آج بھی پروڈکشن منیجر صاحب کے درشن ہو سکیں گے یا نہیں؟"

لو یہ تو پیچھے ہی پڑ گئی۔ یہی تو ان ایکسٹرا لڑکیوں کی حرکتیں ہیں جن سے وہ اپنا شکار پھانستی ہیں۔

"آج تمھیں اسٹوڈیو میں کسی سے ملنے کا موقع نہ ملے گا۔ سب پریشان ہیں"

"کیوں کیا ہوا، کندن جی؟"

کندن جی! کندن جی! کمبخت اس بے چارے کے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی! مگر اس کی آواز میں اتنی ملائمت، اتنی التجا، اتنی معصومیت تھی کہ کندن کسی درشت جملے سے گفتگو کے سلسلے کو نہ کاٹ سکا۔

"کسی سے کہنے کا نہیں۔ معاملہ بڑا پرائیویٹ ہے ...... " اور یہ کہہ کر نازنین کے بھاگ جانے کا واقعہ سنا دیا۔

"اتنی بڑی اور مشہور ایکٹرس بھاگ گئی اور کوئی نہیں جانتا کس کے

ساتھ ؟ کتنے تعجب کی بات ہے ۔"

اب کندن کو اپنی اہمیت جتانے کا موقع ہاتھ آیا ۔ "کوئی نہیں جانتا سوائے ایک آدمی کے "

" وہ کون ؟ "

" وہ میں "

اور پھر رازدارانہ انداز میں اس نے ٹیلیفون کا واقعہ بھی سنا ڈالا ، مردانہ آواز والی سہیلی مس کملا ۔ تاج محل ہوٹل میں چائے کی دعوت وغیرہ اور یہ سن کر اندرا ۔۔۔۔ مغموم اور عمیق آنکھوں والی اندرا ۔۔۔ ہنس دی کھلکھلا کر جیسے نازنین کا بھاگ جانا ایک ٹریجیڈی نہیں بلکہ کامیڈی ہو ۔

" سب پریشان ہیں اور تم ہنس رہی ہو ؟ " اس نے تعجب سے پوچھا ۔

" معاف کرنا کندن جی ۔ میں مس نازنین کی ماں اور نانی کا خیال کرکے ہنس رہی تھی ۔ کتنی محنت سے انھوں نے اس سونا بنانے کی مشین کو تیار کیا تھا اور وہ مشین ایک آدمی کے ساتھ بھاگ گئی "

اور پوپی چنیا بائی کا خیال کرکے کندن بھی ہنس پڑا ۔ ماں اور نانی دونوں کی بری حالت ہوگی ۔ نازنین بھاگ گئی تو ان کھوسٹوں کو کون پوچھے گا ۔ فاقوں کی نوبت آجائے گی ۔ کندن کو ان دونوں زہریلی شہد کی مکھیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ نازنین کی اس نازیبا حرکت کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تھا ۔ وہ کہتا رہا " پھر بھی اسے ماں ، نانی ، اسٹوڈیو ، پکچر سب کو اس طرح چھوڑ کر نہ بھاگنا چاہئے تھا "

"کندن جی" ۔ اندرا بولی اور پہلی بار اس کی معصوم اور میٹھی آواز میں زہر کی ہلکی سی تلخی تھی "عورت کی زندگی میں ماں اور نانی، اسٹوڈیو اور پکچرے پڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ محبت"

فون کی گھنٹی بجی اور وہ ادھر بھاگا۔

"گریٹ آرٹ پکچرز۔ آپ کو کون چاہیئے؟"

وہ گراموفون کے ریکارڈ کی طرح مکانیکی طریقے سے جواب دیتا رہا مگر اس کے دماغ میں اندرا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"سیٹھ صاحب اسٹوڈیو میں نہیں ہیں۔ گھر فون کیجئے"

"کیا کہا؟ نمبر؟ ... گھر نمبر نہیں دیا جا سکتا۔ پرائیویٹ ہے"

"آپ فلمی ہندوستان کے ایڈیٹر نہیں اگر لاٹ صاحب بھی ہوں تو سیٹھ صاحب کا پرائیویٹ نمبر نہیں دے سکتے"

"ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے کہ مس نازنین بھاگ گئی ہیں" فون پھر گھنٹی بجی۔

"نہیں مس نازنین شوٹنگ کو آج نہیں آئی ہیں"

"جی نہیں ان کے گھر کا نمبر بھی نہیں دے سکتا۔ بہت افسوس ہے۔ اور کوئی بات پوچھیئے"

"ان کی ... کا نام؟ نہیں معلوم۔ سب انھیں نازنین کی اماں کہتے ہیں۔ نانی کا نام؟ چنیا جان۔ جس پکچر میں کام کر رہی ہیں اس کا نام ہے تتلی ... ... گر سنئے۔ عورت کی زندگی میں ماں اور نانی، اسٹوڈیو اور پکچر

سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہوتی ہے! وہ کیا ہوتی ہے؟۔ یہ آپ خود سوچئے،،
فون کا چونگا اٹھا کر الگ رکھ دیا تاکہ گھنٹی نہ بج سکے۔ معلوم ہوتا
تھا کہ تمام بمبئی کے اخباروں کے ایڈیٹروں کو اس وقت صرف مس نازنین کی
خیریت کی فکر پڑی ہوئی تھی۔
"آپ تو فلسفی معلوم ہوتی ہیں" کندن نے پھر اندرا کی طرف مخاطب
ہوتے ہوئے کہا۔
"زندگی سب کچھ بنا دیتی ہے"
اب تو کندن کو اس عجیب و غریب معصوم شکل اور فلسفیانہ دماغ
والی ایکسٹرا لڑکی میں دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا یہ
پہلی لڑکی تھی جس نے اس سے سیدھے منہ بات کی تھی۔ پچھلی شام کا خیال
کر کے اس کے کان لال ہو گئے۔ "چھوکرا!" کیا نازنین اسے کسی اور لفظ سے
مخاطب نہ کر سکتی تھی؟ خیر لعنت بھیجو نازنین پر۔ اگر جارجیٹ اور بروکیڈ نہیں
میسر تو سوتی ساڑھی ہی پر کیوں نہ اکتفا کی جائے ۔۔ خصوصاً جب وہ اتنی
اچھی دھلی ہوئی ہو!
"سنئے ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں"
"کہئے"
"آج اسٹوڈیو میں تو کوئی آنے والا نہیں ہے۔ سب شکاری
کتوں کی طرح بھاگے پھر رہے ہیں"
"ٹھیک ہے۔ مگر اس میں میرے برا ماننے کی کیا بات ہے"

"نہیں نہیں۔ وہ بات تو میں نے ابھی کہی ہی نہیں۔ میرا کہنا ہے کہ آج یہاں کام وام تو کچھ ہوگا ہی نہیں اس لئے ہم ... میرا مطلب ہے آپ میرے ساتھ سینما چلیں گی؟"

"چلی چلوں گی۔ مگر ایک شرط پر"

"وہ کیا؟"

"آپ مجھے میرے گھر پر چھوڑ کر آئیں گے"

"بڑی خوشی سے"

اس فلمی Situation کا کندن نے کتنی مدت سے مطالعہ کر رکھا تھا۔ ہیرو ہیروئن کو دعوت دیتا ہے۔ وہ منظور کر لیتی ہے۔ وہ دونوں تاج جاکر دیکھتے ہیں۔ وہ کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کرتے ہیں۔ ہوا سے ہیروئن کے بال اڑ رہے ہیں اور اس کے گورے بیضوی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کی ریشمی ساڑھی کا آنچل ہوا میں ایک انقلابی پرچم کی طرح اڑ رہا ہے۔ ہیرو اپنی صبا رفتار موٹر میں بٹھا کر ہیروئن کو جوہو لے جاتا ہے۔ ناریل کے اونچے اونچے درخت چاندنی رات میں ستاروں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے۔ فضا میں ایک رومانی نشہ۔ میں اور تو۔ تو اور میں ... وغیرہ وغیرہ۔

دفعتاً دماغ کی قلم گویا تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اور ٹٹول کر حساب لگایا کہ اس کے پاس صرف دو روپے تھے اس میں تو سینما بھی نو آنے والے ٹکٹوں میں دیکھنا پڑے گا۔ مگر خیر کوئی پرواہ

نہیں۔ ہیرو غریب ہے۔ پھر بھی ہیروئن کو ایک بڑے ریسٹوران میں لے جاتا ہے۔ ہیروئن کو معلوم ہے کہ اس کے پاس دام نہیں ہیں۔ اس لئے بیرے کے بل لانے سے پہلے وہ اپنے پلاسٹک کے بیگ سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر ہیرو کی جیب میں چپکے سے ڈال دیتی ہے۔ ... ...

امیر ہیرو غریب ہیروئن!

غریب ہیرو امیر ہیروئن!

مگر یہاں تو وہ دونوں غریب تھے۔ یہ Situation فلمی ڈھرے پر نہ چل سکے گی۔

"آیئے تو پہلے کہیں چائے پی لیں"

ایرانی کی دکان۔ کنارے ٹوٹی ہوئی پیالیاں۔ "گورنمنٹ کے دودھ" یعنی پاوڈر کی چائے۔ چاروں طرف میلے میلے کپڑے میلے میلے چہرے اور سب ان دونوں کو نہایت غیر مہذب طریقے سے گھورتے ہوئے۔

"آپ کو چنے پسند ہیں؟"

"جی ہاں۔ کیک پیسٹری ہیچ ہیں، خستہ بھنے ہوئے چنوں کے سامنے"

"ایک آنے کے چنے دینا، بھائی۔ ذرا گرما گرم"

دادر سے لیمنگٹن روڈ کیسے جایا جائے؟ ...

"کہیے بس سے چلیں یا ریل سے یا ٹرام سے؟"

"ٹرام ہی سے چلیے ابھی تو سنیما شروع ہونے میں بہت وقت ہے"

دومنزلہ ٹرام کی چھت پر آگے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے۔ تمام شہر بھاگا پیچھے جارہا ہے۔ سینما سے زیادہ مزیدار تماشہ۔ اور کوئی دلچسپ ہستی ساتھ ہو تو چنے چبانا بھی ایک رومانی فعل ہو جاتا ہے۔

ہنستے، باتیں کرتے (نہایت غیر فلمی اور غیر رومانی قسم کی باتیں مثلاً یہ کہ ہمارے کرنال میں تو ایک پیسے میں اس سے دگنے چنے ملتے تھے یا یہ کہ راشن کی دوکان سے چاول اور گیہوں کس بھاؤ ملتے ہیں)، وہ ہمینگٹن روڈ پر پہنچے۔

"کون سا فلم دیکھیں؟"

"کوئی سا بھی۔ مجھے فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے"

"پھر بھی آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں"

"پیٹ جو پالنا ہوا"

"آپ تو فلسفی معلوم ہوتی ہیں"

"یہ آپ پہلے بھی کہہ چکے ہیں"

"خیر چلیے۔ کلپنا دیکھیں"

"چلیے۔ میں نے اودے شنکر کی بہت تعریف سنی ہے"

پانچ آنے کے ٹکٹ ختم، دس آنے کے ٹکٹ ختم۔ سوا روپے کے ٹکٹ ختم۔ صرف ڈھائی روپے والے ٹکٹ مل سکتے تھے:

بلیک مارکٹ! دس آنے کا ٹکٹ ایک روپے میں۔ دس آنے کا ٹکٹ ایک روپے میں! اور کندن کی جیب میں اب صرف ایک روپیہ آٹھ آنے

"چھوڑیے پھر کسی دن دیکھیں گے"

"مالابار ہل ہینگنگ گارڈن دیکھنے چلتی ہیں آپ؟ سیر ہی ہو جائے گی" اس نے خفت مٹانے کے لئے کہا۔

"چلئے۔ بجائے بند سینما میں دھوئیں اور زہریلے سانسوں کے سمندر کی تازہ ہوا کھائیں"

کتنی سمجھدار تھی یہ لڑکی! کوئی دوسری ہوتی تو سینما نہ دیکھنے پر ناک بھوں چڑھاتی اور نہ جانے کتنے نخرے کرتی۔

رج روڈ کے گھنے سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں پیدل چلتے ہوئے وہ ہینگنگ گارڈن پہنچ گئے۔ مغربی کنارے پر کھڑے ہو کر غروب آفتاب کا منظر دیکھا۔ سماں اس قدر دلفریب تھا کہ کئی منٹ تک دونوں چپ چاپ کھڑے سمندر کی جانب دیکھتے رہے۔ اور کندن کو معلوم ہوا کہ کبھی کبھی خاموشی بھی بامعنی اور پُراثر ہوتی ہے۔

واپسی پر اندھیرا ہو گیا اور سڑک کی روشنیاں چمک اٹھیں۔

"اب آپ کو مجھے گھر چھوڑ کر آنا ہوگا"

"کہاں رہتی ہیں آپ؟"

"بوری بندر کے قریب"

کندن نے سوچا وہ تو بڑھیا علاقہ ہے۔ شاید کسی اچھے فلیٹ میں رہتی ہوگی۔ اور اس کے تحت الشعور نے ایک اوباش کی طرح کھنکھار کر اور آنکھ مار کر کہا "شکار پھنس گیا"

بھلا اور کیوں ایک کنواری ایک نوجوان مرد کو رات کے وقت اپنے کاشانۂ عشرت میں آنے کی دعوت دینے لگی ؟ "کاشانۂ عشرت" نہ جانے کسی شاعر کی نظم میں اس نے یہ جملہ پڑھا تھا۔ کاشانۂ عشرت! ریشمی گلابی لیمپ شیڈ۔ دھیمی دھیمی روشنی۔ فرش پر ایک نرم قیمتی قالین۔ دیوار پر چند خوبصورت عورتوں کی روغنی تصویریں۔ کونے میں ایک بڑا پلنگ سفید چادریں۔ سفید تکئے۔ ریشمی مسہری نہ جانے کتنے ناولوں، افسانوں اور نظموں کو پڑھ کر اور کتنے فلموں کو دیکھ کر اس کے دماغ نے یہ کاشانۂ عشرت سجایا تھا!

ہاں تو بھلا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک کنواری ایک نوجوان مرد کو رات کے وقت اپنے کاشانۂ عشرت میں آنے کی دعوت دے ؟

کندن کی مردانگی نے اُسے فتح کی مبارکباد پیش کی۔ کندن نے اپنے گالوں کو تمتمایا ہوا پایا۔ اپنے تمام بدن میں ایک سنسنی سی محسوس کی۔ جس گھڑی کا اسے کئی برس سے انتظار تھا، آرزو تھی، وہ آن پہنچی تھی۔ مگر مسرت کے ساتھ ایک ہلکی سی اُداسی اور مایوسی بھی، جیسے ایک طویل سفر ختم ہونے پر منزل اتنی خوش آئند نہ ثابت ہو جیسی امید تھی۔!

چڑیل

(جس میں ہیروئن ہیرو کو گڑ کی چائے پلاتی ہے)

بوری بندر!

شام سے انسے توان کے سامنے ایک نہ دو چھ سات راستے تھے۔
ایک تو بڑی سڑک جو ایک طرف سیدھی ریگل سینما، اپالو بندر اور تاج محل ہوٹل کی طرف جا رہی تھی اور دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا کے دفتر کے سامنے سے ہوتی ہوئی کرافورڈ مارکیٹ۔ ایک سڑک دھوبی "تلاؤ" جاتی تھی مگر اس راستے سے تو وہ ابھی آئے ہی تھے۔ ایک اور کیپٹل سینما کے برابر سے خالص ولایتی بمبئی جم خانہ کو۔ اور دوسری وکٹوریا ٹرمنس اسٹیشن کے سامنے

سے ہوتی ہوئی سینٹ جارج ہسپتال کو۔ مگر جس راستے پر اندرا اسے ساتھ لے کر چلی وہ کچھ اور ہی تھا۔

جنرل پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرتے ہوئے فریر روڈ۔ جہاں مشتبہ قسم کے ہوٹل، پنجابی نانبائیوں کی دکانیں اور شرابی ملاح پائے جاتے ہیں! یہ وہ علاقہ ہے جہاں بندرگاہ میں آئے ہوئے جہازوں کا انسانی کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

"تم اس سڑک پر رہتی ہو؟"

"سڑک پر نہیں اس اگلی گلی میں!"

اور کسی نے جیسے کندن کے "کاشانۂ عشرت" کو منہدم کر ڈالا ہو۔ گلی میں صرف ایک زرد رو روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ اندھیری اونچی عمارتیں شرابیوں کی طرح ایک دوسرے پر گری پڑ رہی تھیں۔ مچھلی، تیل، دال کے تڑکے، بیر، تاڑی، فنائل اور نہ جانے کتنی غیر معلوم اور مکروہ چیزوں کی ملی جلی بساند جو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں کتنے ہی چوہے چھچھوندروں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ایک کالی بلی اپنی سبز آنکھیں چمکاتی ہوئی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ ایک مریل خارشی کتے میں الجھ کر کندن تقریباً گر پڑا۔

تو یہاں رہتی تھی اندرا! کندن کے رومانی خوابوں کی تعبیر کتنی خوفناک نکلی۔

ایک مکان کے سامنے ٹھہر کر اندرا نے کہا "یہاں رہتے ہیں ہم۔"

تیسرے مالے پر۔"

کندن نے جان چھڑانے کے لئے کہا " اچھا تو میں چلا نمستے "

"نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ اتنی دور تکلیف کر کے آئے ہیں میری ماتاجی کیا کہیں گی کہ ایک پیالی چائے کو بھی نہیں پوچھا "

زینے پر گھپ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہر منزل پر گیلری میں لوگ سوئے ہوئے۔ اندرا کو اس زینے پر چڑھنے کی عادت تھی، وہ کٹہرے کے سہارے چڑھتی چلی گئی۔ مگر کندن کو بڑی مشکل پڑی۔ لکڑی کی سیڑھیاں برسوں کے استعمال سے گھس چکی تھیں۔ ایک جگہ پاؤں اوچھا پڑا اور وہ گرتے گرتے بچا۔

" لائیے اپنا ہاتھ، نہیں تو آپ گر پڑیں گے "

اور کندن کو محسوس ہوا کہ اندھیرے، بوسیدہ، غلیظ مکان میں بھی دو ہاتھوں کے ملنے سے ایک نرم رو بدن میں کوندجاتی ہے۔ کتنا نرم اور معصوم تھا وہ ہاتھ۔ کتنا بھروسہ تھا اس میں۔ دوستی، رفاقت، پیار... مگر وہ "کاشانۂ عشرت" والا پیار نہیں!۔

جلد ہی وہ تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اندرا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی " آگئی اندو؟ " اور دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں ایک مریل بلب کی روشنی دھوئیں کی وجہ سے اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ یہ کمرہ ہی سارا گھر تھا۔ ایک کونے میں بچھونوں کا ڈھیر تھا، دوسرے میں چولھا تھا جہاں سے دھواں اٹھ کر سارے کمرے میں پھیل رہا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی۔ ایک ٹین کا صندوق

الگنی پر دو بوسیدہ ساڑھیاں دھو کر سوکھنے کے لئے لٹکائی ہوئی تھیں۔ یہ تھا اندرا کا "کاشانۂ عشرت"، جہاں وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔

"کندن جی! یہ ہیں میری ماتا جی — اور ماں! یہ ہیں کندن بابو۔ بس سارے اسٹوڈیو میں یہی ایک شریف آدمی۔ بڑی کرپا کر کے مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے ہیں"

"نمستے"

"جیتے رہو بیٹا"

دہلی یا آگرے کی آواز! کندن نے غور سے اندرا کی ماں کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر اس کی تمام زندگی کی کہانی جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ غربت۔ محنت۔ مشقت۔ دکھ۔ بیماری۔ دھوئیں سے بھری ہوئی کوٹھری ایک ظالم، شرابی شوہر۔ جوان بیٹی کی شادی نہ کر سکنے کا غم۔ فاقے۔ ان جھریوں میں کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔ اس کا چہرہ ایک کھنڈر کی مانند تھا — گری ہوئی چھت، ٹوٹی ہوئی دیواریں، ملبے کا ڈھیر۔ پھر بھی کندن کو اس میں ایک جانی پہچانی جھلک نظر آئی۔ آنکھوں میں وہی معصومیت، وہی بھولپن، وہی متانت جو اندرا کی آنکھوں میں تھی۔ اور جسے عمر بھر کی مصیبتیں اور مشقتیں بھی فنا نہ کر سکی تھیں۔

اندرا کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر کندن نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ واچا گنی کی باتیں سن کر اس کے بارے میں کچھ اچھا خیال نہ قائم ہوا تھا۔

ایک کونے میں چند خالی بوتلیں لڑھک رہی تھیں اور تاڑی کی کھٹی کھٹی بو آ رہی تھی۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیوں اپنی بیٹی کو تین روپے پیشگی کے عوض ناداگنجا کے ہاتھ بیچ آیا تھا۔

اندرا نے بغیر پوچھے چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔ اس کی ماں نے کسی قدر ہچکچاہٹ سے کہا "گڑ کی چائے پینا تو آپ کیا پسند کریں گے"

کندن جو اس گھرانے کی بابت سوچ رہا تھا چونک پڑا "جی۔ کیا کہا گڑ کی چائے؟ ہاں ہاں کیوں نہ پیونگا۔ بازار میں کون سی اصلی شکر کی چائے ملتی ہے۔ اور پھر پاؤڈر کا دودھ۔ دور سے بو آتی ہے"

راشن کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر اندرا کی ماں نے اپنے وطن میرٹھ کا ذکر شروع کر دیا۔ بے تکلفی سے۔ جیسے کسی گھر والے سے بات کرتے ہیں۔ وہ لوگ ذات کے کائستھ تھے۔ کندن نے نہ جانے کیوں زور دے کر کہا "میں بھی کائستھ ہی ہوں" اندرا کا باپ چھاؤنی میں دکان کرتا تھا وہاں فوجیوں کی دیکھا دیکھی شراب کی لت لگ گئی۔ ساری پونجی بوتلوں کی نذر ہو گئی۔ جنگ کے زمانے میں ایک جہاز پر نوکری کر لی۔ وہاں شراب کی عادت اور بھی پکی ہو گئی۔ کام رسد خریدنے کا تھا۔ سرکاری مال کی چوری کے جرم میں نکالا گیا۔ اب چھ مہینے سے بے کار تھا۔

اور کندن نے سوچا۔ ان چھ مہینوں میں اندرا کی ماں کے چہرے پر کتنی [illegible] ں گی۔ گھر کی کون کون سی چیزیں بکی ہوں گی کہ نوبت بیٹی تک آ گئی تھی۔

چائے تیار کر کے اندرا کندن کے لئے بے پرچ کی پیالی میں لائی۔ خود اس نے ایک کنڈا ٹوٹی پیالی میں پی اور ماں کو کٹورے میں دی۔ چائے اچھی تھی۔ گرم اور میٹھی۔ پی کر کندن اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹا! تم سے مل کر بڑا اطمینان ہوگیا۔ ذرا اندرا کا خیال رکھنا۔ زمانہ برا ہے۔" کاش کندن اسے بتا سکتا کہ زمانہ کتنا برا تھا! اسے یہ خیال کر کے شرم آگئی کہ وہ خود جسے اتنا شریف سمجھا جا رہا تھا کس قسم کے ارادوں اور امیدوں سے وہاں آیا تھا۔

"ٹھہریئے میں آپ کو روشنی دکھاتی ہوں۔ نہیں تو آپ پھر گر پڑیں گے" یہ کہہ کر اندرا نے ایک ٹین کا چراغ جلایا اور لے کر باہر آئی۔

"نمستے ماتا جی!" نہ جانے اس کی زبان سے یہ الفاظ کیسے نکلے تھے۔ اس کے دل کی کسی تہہ میں اسے اپنی ماں یاد آئی تھی جسے وہ کرنال میں چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔

چراغ کی روشنی میں زینے پر اترتے ہوئے اس نے اندرا سے کہا "چائے کا شکریہ۔"

"شرمندہ کرتے ہیں آپ؟"

کندن نے نیچے سے سر اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ چراغ ہاتھ میں لئے اندرا کٹہرے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی جھلملاتی ہوئی لو کی ہلکی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی جو اس وقت پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور معصوم نظر آتا تھا،

اندرا کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس میں وعدہ، شکریہ، رحم، دوستی، دل لگی اور دکھ سب کچھ تھا۔

کندن ایک لمحے کے لئے مبہوت ہوگیا۔ اور اس کے فلم زدہ دماغ نے سوچا۔ کاش میری آنکھیں کیمرے کا لینز ہوتیں اور میں اس خوبصورت منظر کو ہمیشہ کے لئے قلم بند کر سکتا۔

جوں جوں وہ زینہ اترتا گیا، اندرا کے چراغ کی روشنی کم ہوتی گئی۔ مگر نیچے اتر کر جب اس نے زینے کے اندھیرے کنوئیں کی تہہ سے اوپر کی طرف دیکھا تو اسے چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہی میں ایک ننھی سی لَو چمکتی ہوئی نظر آئی۔ بہت دور۔ بہت اونچائی پر!

وہ گیلری میں راستہ ٹٹول کر باہر جا رہا تھا کہ تاڑی کی بدبو کے بھبکے کے ساتھ ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا۔ باہر سڑک کی پیلی روشنی کے خلاف دروازے میں کھڑا ہوا وہ ایک سیاہ اور عجیب دو ٹانگ کا جانور معلوم ہوتا تھا۔

"اندرا کا باپ" اس نے سوچا اور بچنے کے لئے دیوار کے سائے میں دبک گیا۔ شرابی لڑکھڑاتا، گالیاں بکتا، ٹھوکر کھاتا زینے پر چڑھتا گیا۔ اور کندن دروازے کی طرف بھاگا۔

باہر گلی میں کھڑے ہو کر ایک بار پھر اس نے اندرا کے مکان پر نظر ڈالی۔ اندھیرا۔ ڈراؤنا۔ مہیب۔ مگر اس میں کتنی ہی ننھی ننھی کھڑکیاں چمک رہی تھیں۔ اور کندن نے سوچا کہ ان میں سے ایک ننھی سی روشنی

اندرا ہے۔ اب اسے وہ گلی اتنی متعفن اور غلیظ نہ معلوم ہوئی جتنی آدھ گھنٹہ پہلے تھی۔

سیٹی بجاتا ہوا وہ بڑی بستی کی طرف چلا۔ یہاں تک کہ اندھیرے میں فیڈ آؤٹ ہوگیا۔

اِنٹرول

(پان، بیڑی، چائے، لیمن، سوڈا، رس بھری، مونگ پھلی، کھاما پستہ، آئس کریم ... ...)

ساتواں ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کی خاطر اپنا فیصلہ تبدیل کرتا ہے)

ریل غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"دیکھئے، باسو صاحب۔ اگر آپ کو میری کہانی پسند نہیں ہے تو پھر آپ نے خریدی ہی کیوں؟ اتنی تبدیلیاں کرنے سے تو بہتر ہوگا کہ آپ میری کہانی واپس کر دیں اور خود لکھ لیں۔ آپ مجھے پانچ ہزار کس لئے دے رہے ہیں۔"

ڈائرکٹر باسو نے نہایت ملائمت سے سمجھایا: "پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں آپ کے نام کے۔ ساہتیہ میں آپ نے اتنا نام بنایا ہے تو کس لئے۔

پھر آپ کی کہانی کا نام۔ سُرکھ سبیرا۔ اچھا نام ہے۔ ذرا revolutionary colour ہے اس میں۔ آج کل ایسے نام اچھے چلتے ہیں۔ اور آپ کی کہانی میں کئی incident بھی اچھے ہیں۔ ہیرو کا کیریکٹر بھی ہم نے وہی رکھا ہے۔ آپ نے مل مزدور دکھایا تھا ہم نے ریڈیو سنگر بنا دیا ہے۔ گانا بھی تو ہونا۔ اور گانا ایک دم revolutionary لگا دینے گا۔ سارے دیش میں آگ لگا دے گا"

کندن یہ سب گفت گو باہر برآمدے میں کھڑا سن رہا تھا۔ نرمل سے زیادہ اُسے غصہ آ رہا تھا۔ آخر ان ڈائرکٹروں کو یہ کیا مرض تھا کہ اچھی خاصی کہانی کا ستیاناس کرنے پر تلے رہتے تھے۔ نرمل ہندستان کا اتنا مشہور لیکھک تھا کندن نے کہیں پڑھا تھا کہ اس کی کہانیاں نہ صرف انگریزی میں ترجمہ ہو کر انگلستان اور امریکہ کے مشہور رسالوں میں شائع ہوئی تھیں بلکہ فرنچ اور جرمن میں بھی چھپی تھیں۔ ایسے لیکھک کی کہانی میں ڈائرکٹر بے سوچے سمجھے ردّ و بدل کرے یہ کہاں کا انصاف تھا۔ مگر آئے دن اسٹوڈیو میں یہی ہوتا رہتا تھا۔ ایک ڈائرکٹر نے منشی پریم چند جی کے ایک مشہور ناول کو کند چھری سے قتل کیا تھا، ایک اور نے کرشن چندر کی کہانی میں صرف اتنی تبدیلی کی تھی کہ ہیرو کو ایک کشمیری کسان کے بجائے راجستھان کا ایک نوجوان زمیندار بنا دیا گیا تھا اور ہیروئن کو ہاتو کی بیٹی کے بجائے شاہی محل کے مالی کی بیٹی —— جو آخری ریل میں ایک زمیندار کی لڑکی ہی ثابت ہوتی ہے (پیدا ہوتے ہی لڑکی محل سے ہٹا لی گئی تھی اور اس کے بدلے میں مالی کا بیٹا وہاں رکھ دیا گیا تھا)،

... مگر کندن کو یقین تھا کہ نرمل جیسا انقلابی مصنف باسو کی ایک نہ سنے گا بلکہ ایسی کھری کھری سنائے گا کہ ڈائرکٹر صاحب بھی یاد کریں گے۔ کیا نرمل نے اپنے افسانوں کے مجموعے "خون اور پسینہ" کے مقدمے میں نہیں لکھا تھا کہ "دنیا کی ہر نعمت خریدی جا سکتی ہے، دولت، عزت، مکان، لباس بہترین غذا، یہاں تک کہ عورت کا جسم بھی خریدا جا سکتا ہے۔ ووٹ خریدے جا سکتے ہیں سیاست داں اور لیڈر خریدے جا سکتے ہیں۔ مگر فن کار کا قلم نہیں خریدا جا سکتا"

کندن نے دروازے کی طرف کان لگا دیئے اس انتظار میں کہ کب نرمل اپنی زبان کی ایک جنبش سے ڈائرکٹر باسو کے تمام دلائل کو چکنا چور کرتا ہے۔

باسو کہہ رہا تھا "دیکھیئے نرمل جی، یہ فلم اسٹوڈیو ہے۔ یہاں بڑے بڑے لیکھکوں کی کہانیاں بدل دی جاتی ہیں۔ ساہتیہ اور چیز ہے سینما اور۔ ہمیں باکس آفس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سیٹھ جی کے تین لاکھ روپے اس پکچر پر لگنے والے ہیں۔ اگر اس میں ہم نے دس بارہ گانوں کی منجائش نہ رکھیں تو کوئی ڈسٹری بیوٹر ہاتھ بھی نہ لگائے گا"

کندن نے سوچا۔ اب نرمل کہے گا "بھاڑ میں جائیں آپ، آپ کے سیٹھ جی اور آپ کا باکس آفس۔ میں اپنی کہانی کو بدلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

مگر نرمل خاموش رہا اور باسو کا پارہ اوپر چڑھتا رہا۔ اور اس کی

آواز بھی۔

"اگر آپ کہانی بدلنا نہیں چاہتے تو آپ کو ہزار روپے جو ایڈوانس دیئے گئے ہیں وہ واپس کر دیجیئے اور کنٹراکٹ پھاڑ ڈالئے۔ ہم منشی پردیسی سے دوسری کہانی لکھوا لیتے ہیں"

"یہ لیجیئے اپنے روپے میں اپنے قلم کو کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا"

مگر یہ الفاظ نرمل کی زبان سے نہیں نکلے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے مری ہوئی سی آواز میں کہا "نہیں، باسو صاحب۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ فلموں کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ تبدیلیاں ضروری ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں ڈائلاگ دوسرے لکھوا لاؤں گا۔ رات بھر کی مہلت دیجیئے تاکہ میں اسی نئی لائن پر غور کر سکوں"

کاغذات جمع کرنے اور چمڑے کے تھیلے میں ٹھونسنے کی آواز آئی۔ اور ڈائرکٹر باسو کی آواز سلام مگر تیرے سلیے طنز سے بھری ہوئی "ہم تو آپ ایسے لیکھکوں کی مدد کرنا چاہتا ہے نرمل جی۔ نہیں تو کہانی ڈائلاگ تو دو ہزار میں دس رائٹر لکھنے کو تیار ہیں"

"نمستے، باسو صاحب" کل حاضر ہوں گا"

"نمستے"

کندن، نرمل کے باہر نکل آنے سے پہلے ہی کھسک آیا۔ اس کے دماغی مندر کا ایک بت اور آج ٹوٹ گیا تھا۔ نرمل ــــ نقادی۔ باغی نرمل ــــ نے ہزار روپے کی خاطر وہ قلم بیچ دیا تھا جو آج تک کبھی نہ بکا تھا

جب نرمل برآمدے میں باہر نکلا تو کندن نے ایک نظر میں دیکھا کہ
اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اُس نے کندن سے بات
نہیں کی بلکہ جلدی سے منہ پھیر کر سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا
ہوا اسٹوڈیو سے باہر چلا گیا۔

کندن کو اس اخلاقی شکست پر زیادہ دیر غور کرنے کی مہلت نہ ملی
ڈائرکٹر ہنڈا کے دونوں اسسٹنٹ چوپڑا اور رام ہوٹل کی طرف سے باتیں
کرتے ہوئے آرہے تھے۔ کندن کو دیکھ کر انھوں نے اُسے اشارے
سے اپنی طرف بلایا اور املی کے درخت کے نیچے والے چبوترے پر بیٹھ
گئے۔

"نمستے رام جی، نمستے چوپڑا جی۔ کیا حکم ہے؟"

"کندن۔ آج شام کو یونین کی میٹنگ ہے۔ تمھیں بھی چلنا چاہیے"

"یونین؟ کیسی یونین؟"

"فلم ورکرز یونین۔ ہم سب اُس کے ممبر ہیں تمھیں بھی ممبر بننا
چاہیے" چوپڑہ نے کہا

"پر چوپڑہ جی یونین تو مزدوروں کی ہوتی ہے"

"تو کیا ہم اسٹوڈیو میں کام کرنے والے مزدور نہیں ہیں" رام نے
جواب دیا۔ "کیا سیٹھ اور سرمایہ دار ہم کو بھوکا نہیں مارتے؟ مجھے پانچ
برس ہو گئے ہیں اسسٹنٹی کرتے ستر روپے تنخواہ ملتی ہے۔ تمھاری کیا
تنخواہ ہے؟"

"تیس روپے ماہوار" کندن نے جھجکتے ہوئے اقرار کیا۔
"اور جانتے ہو مل کے مزدور کو کیا ملتا ہے؟ ساٹھ ستر روپے ماہوار"
رام نے کہا اور چوپڑہ نے لقمہ دیا "تم سے کہیں زیادہ تو میونسپلٹی کے
بھنگیوں کو تنخواہ ملتی ہے"
کندن کو ہرگز یہ اچھا نہیں لگا کہ اس کا مقابلہ بھنگیوں اور کارخانے
کے مزدوروں سے کیا جائے، مگر رام نے اسے بولنے کا موقعہ ہی نہیں دیا
"اور جانتے ہو کیوں مل کے مزدور اور بھنگی ہم سے بہتر حالت میں ہیں؟
اس لیے کہ ان کی اپنی اپنی یونین ہے جو مزدوروں کے حقوق کی حفاظت
کرتی ہے"
ٹالنے کی خاطر کندن نے وعدہ کر لیا کہ وہ جلسے میں آ جائے گا مگر
اس کا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ کون یونین وونین کے جھگڑوں میں پڑے۔ آج
اُسے تنخواہ ملی تھی۔ اور اس کا ارادہ تھا کہ کوئی فلم دیکھے گا۔ پروڈکشن مینیجر کے
کمرے سے سروپ کو نکلتے دیکھا تو سوچا اسے بھی ساتھ لے جائے۔
"چلو سروپ کیا یاد کرو گے کسی رئیس سے پالا پڑا تھا تمہیں آج
سینما دکھا لاتا ہوں"۔ مگر سروپ نے اس کی دعوت کو منظور نہیں کیا۔ "تم جاؤ
میں تو میٹنگ میں جا رہا ہوں"
"منی... مرضی!" اور میٹنگ کے ذکر سے ٹھٹک کر کیسی
میٹنگ؟"
"یونین کی میٹنگ"

"تم بھی یونین میں ہو؟"

"ہاں اور کیا؟"

"اور مرنا؟"

"وہ بھی آج ہی ممبر بنا ہے۔ تم بھی کیوں نہیں چلتے"

نہ جانے کیوں کندن کو اس یونین سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ جس کو دیکھو یونین ہی کا ذکر۔ اس کے علاوہ اس نے دور سے اندرا کو آتے دیکھا تو سوچا آج ہم ضرور اکٹھے سینما جائیں گے۔ چاہے ڈھائی ڈھائی روپے کے ٹکٹ ہی کیوں نہ خریدنے پڑیں۔ سو اس نے سروپ کو بھی ٹال دیا۔ "اچھا تم چلو۔ موقعہ لگے گا تو میں بھی آؤں گا"

سروپ جلدی میں تھا اس نے اپنا راستہ لیا اور کندن اندرا کی طرف مخاطب ہوا۔ وہ حسب معمول سوتی دھلی ساڑھی میں ملبوس تھی مگر نہ جانے کیوں کندن کو وہ اور دنوں سے زیادہ خوبصورت نظر آئی۔

"میں نے کہا جی نمستے" اس نے تپاک سے کہا۔

"نمستے کندن جی" اندرا نے اپنے نازک ہاتھوں کو جوڑتے ہوئے جواب دیا۔ اور ان ہاتھوں کو دیکھ کر کندن کو اس رات کا زینے پر چڑھنا یاد آ گیا جب چند لمحوں کے لیے ان کے ہاتھوں نے ایک دوسرے کو چھوا تھا۔

"آج ہم ضرور سینما جائیں گے" بجائے دعوت دینے کے اس نے فیصلہ ہی سنا دیا۔

"مجھے تو معاف کیجئے۔ میں آج نہ جاسکوں گی"

"کیوں کیا کوئی خاص کام ہے؟"

"آج سنا ہے یونین کی میٹنگ ہونے والی ہے۔ آپ نہیں جا رہے ہیں"

"اوہ — یونین کی میٹنگ! — آپ نے خوب یاد دلایا ... ہاں ہاں کیوں نہیں جا رہا ہوں۔ آیئے اکٹھے ہی چلیں"

"چلئے"

راستے میں اُس نے پوچھا "آپ کئی دن سے نظر نہیں آئیں کہاں رہیں"

"میں پنچ گنی گئی تھی"

"پنچ گنی؟" — وہ تو رئیسوں کی تفریح گاہ تھی یا بیماروں کا سینی ٹوریم ایک غریب اکسٹرا لڑکی کا وہاں کیسے گزر ہوا؟

اندرا نے جیسے اس کے خیالات اور شبہات کو پڑھ لیا ہو "میری ایک سہیلی وہاں تپ دق کے سینی ٹوریم میں ہے۔ اُس نے بلایا تھا۔ دس برس بعد ملی۔ ہم دونوں میرٹھ میں ساتھ پڑھتے تھے پرائمری اسکول میں"

"اکیلی رہتی ہے آپ کی سہیلی وہاں؟"

"ہاں — مگر نرمل صاحب کبھی کبھی جاتے ہیں"

"نرمل صاحب؟"

"ہاں مشہور ریکھک نرمل سکسینہ کی بیوی ہے۔ بہت چاہتے

ہیں اُسے۔ ڈاکٹروں نے تقریباً جواب دے دیا ہے۔ مگر وہ اس کے علاج کے لئے کتنی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ بنگلہ لے کر رکھا ہے۔ نرس رکھی ہے۔ کم سے کم ہزار روپے مہینے کا خرچ ہے ... کیوں آپ چپ کیوں ہوگئے۔ کیا آپ نرمل جی کو جانتے ہیں؟"

"نہیں" ۔ اس نے سچ کہا۔ کیونکہ وہ صرف لیکھک نرمل سے اور اس کی لکھائی سے واقف تھا۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ آزاد قلم کیوں بازار میں بکتے ہیں — اور کس بھاؤ!

نہیں۔ میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا"

آٹھواں ریل

(جس میں ہیروئن بجائے مغموم غزل گانے کے ایک انقلابی
نعرہ بلند کرتی ہے)

فلم ورکرز یونین کا جلسہ بجائے چھ بجے کے پونے سات بجے شروع ہوا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً چھ سو کے قریب تھی۔ کندن کو امید تھی کہ شاید جلسے کے بہانے بڑے اور مشہور فلمی "ستاروں" کے درشن ہو جائیں گے مگر اُسے مایوسی ہوئی جب اُس نے سوائے کھدر پوش پرتھوی راج کے ایک بھی نامور سے ایکٹر یا ایکٹرس کو وہاں نہ پایا۔ مگر چھوٹے درجے کے

ایکٹر، ایکسٹرا مرد اور عورتیں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ کیمرہ مین لائٹ قلی وغیرہ کافی تعداد میں موجود تھے۔

کندن کے لئے کسی یونین کے جلسے میں شرکت کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا اور دراصل وہ آیا بھی تھا اندرا کی خاطر نہ کہ فلمی مزدوروں کے اقتصادی تحفظ کی خاطر۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید اندرا کو بھی اس جلسے میں صرف تفریحی دلچسپی ہوگی۔ مگر جس انہماک سے وہ ہر تقریر کو سن رہی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ایسے جلسوں میں وہ پہلے بھی شریک ہوئی ہے۔ شراب میں اپنے آپ کو ڈبونے سے پہلے میرے پتاجی بھی سی سینز یونین کے ممبر تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی یونین کے جلسوں میں جایا کرتی تھی۔ اس نے فخریہ لہجے میں کندن کو بتایا۔ اور کندن کو یہ سوچ کر کافی شرم محسوس ہوئی کہ فلمی فنکار اور اداکار بھی اب ملاحوں اور خلاصوں کے درجے پر آگئے ہیں۔

تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے میں نہ آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر گمنام ایکٹر، ہر ایکسٹرا، ہر اسٹوڈیو قلی اپنی زباندانی کی دھاک بٹھانے پر تلا ہوا ہے۔ مگر سوائے پرتھوی راج کے کسی ایک کو بھی تقریر کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ کوئی گھبراہٹ کے مارے ہکلا رہا تھا، کوئی اٹک اٹک کر کاغذ پر لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہا تھا، کوئی مالکوں کے خلاف الزامات لگاتے وقت مڑ مڑ کر ادھر ادھر دیکھتا جاتا تھا کہ شاید سیٹھ کا کوئی جاسوس چھپا بیٹھا ہو۔ کندن کو پہلے ان تقریروں کو سن کر ہنسی آئی، پھر غصہ آیا۔ مگر کچھ عرصے بعد آہستہ آہستہ فلمی اقتصادیات کے موٹے موٹے نکتے اس کے دماغ میں اترتے

پر چلے گئے۔

مالک اور سیٹھ بعض فلموں پر پچاس فی صدی سے لے کر تین سو فی صدی تک منافع کماتے ہیں لیکن جن کام کرنے والوں کے گاڑھے پسینے سے یہ منافع حاصل ہوتا ہے ان کو اس میں سے ایک پائی بھی نہیں ملتی۔

کالج کے پڑھے اور تجربہ کار ٹیکنیشنز Technicians، مثلاً کیمرہ مین، ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور لیبارٹری والوں کو اتنی کم تنخواہ ملتی ہے کہ اس سے زیادہ تو اوسط درجے کی ایکسٹرا لڑکیاں مہینے میں آٹھ دس دن کام کر کے کما لیتی ہیں۔

کسی اسٹوڈیو میں بھی ملازموں کو وہ حقوق اور رعایات حاصل نہیں ہیں جو ہر کارخانے کے مزدوروں کو ملی ہوئی ہیں۔ نہ پنشن، نہ پراویڈنٹ فنڈ، نہ انشورنس، نہ بندھی ہوئی ترقی، نہ قاعدہ نہ قانون۔ جب سیٹھ جی کی مرضی ہو کان پکڑ کر نکال دیں۔ نہ داد نہ فریاد۔

چھوٹے درجے کے اسٹاف سے ایک دن میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ گھنٹے تک بلا اوور ٹائم دیئے کام کرایا جاتا ہے۔ اور کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ دبی زبان سے شکایت کرو تو پروڈکشن منیجر اور مالک کے دوسرے گرگے صاف کہہ دیتے ہیں "اگر ان شرائط پر کام نہیں کرنا ہے تو کوئی اور کام ڈھونڈ لو"

بجلی کا کام کرنے والے فنیوں کو اپنی جان ہتھیلی پر لے کر کام کرنا

پڑتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا رہتا ہے۔ ہر سال دو ایک مر بھی جاتے ہیں۔ پھر بھی ان کے پسماندہ خاندانوں کے لئے مالی مدد کا کوئی انتظام نہیں تھا (کندن کو اپنا "بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ" والا کام اور اس کے خطرات یاد آ گئے)

مگر کندن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مرزا نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر ایکسٹراز کی طرف سے ایک زوردار تقریر کی اور دادا گنجا جیسے ایکسٹرا سپلائرز کا پول کھول دیا کہ کس طرح ایکسٹراز کی آمدنی کا بیشتر حصہ ہر حالت میں ان کی جیب ہی میں پہنچتا ہے۔ خود ایک ایکسٹرا کی یہ ہمت کہ وہ بھرے جلسے میں دادا گنجا اور اس کی برادری پر حملہ کرے! اور تو اور دبلے پتلے سروپ نے بھی جوش میں آ کر اسی سلسلے میں ایک تقریر کر ڈالی جو کسی نے سنی اور اکثر نے نہیں سنی۔ کیونکہ اس وقت حاضرین میں سے تقریباً ہر ایک تقریر کرنے کے لئے تیار تھا۔ اور بہت سے بغیر اسٹیج پر آئے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے تقریر کر بھی رہے تھے!

کندن نے اسٹوڈیو میں کام کرنے والوں کو اس انقلابی روپ میں نہیں دیکھا تھا۔ وہی تقریریں جن کو سن کر وہ شروع میں ہنس رہا تھا آہستہ آہستہ اس کے دل و دماغ میں ایک نشہ، ایک جنون، کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں۔ اس کے نوجوان دل کی دھڑکن پکار پکار کر اس سے کہہ رہی تھی! "کیا تجھ میں احساس خودداری بالکل نہیں ہے؟ کیا تو ہمیشہ مالکوں کی ٹھوکریں کھانے پر قانع رہے گا؟ کیا تو انصاف اور اپنی جماعت کے اقتصادی مفاد

کی خاطر اپنی آواز نہیں اٹھائے گا؟"

"آپ بھی کیوں نہیں بولتے؟"

جوں جوں جلسے کی کارروائی میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی تھی وہ برابر میں بیٹھی ہوئی اندرا کو بھول ہی گیا تھا۔ شور اور ہٹرونگ میں اس کی سریلی ہلکی آواز ایسی معلوم ہوئی ہے جیسے کسی زوردار اور شور مچاتے ہوئے آرکسٹرا میں دفعتاً ایک بانسری کی لے شروع ہو جائے ـــــ مگر وہ بھی آرکسٹرا کی دھن سے ہم آہنگ!۔

"آپ بھی کیوں نہیں بولتے؟"

ان الفاظ میں اشارہ تھا، دعوت تھی، درخواست تھی، حکم تھا اس کے علاوہ خود کندن کے اپنے دل کی آواز بازگشت بھی تھی۔

اگلے مقرر نے جیسے ہی اپنی تقریر ختم کی کندن لپک کر اسٹیج پر چڑھ گیا۔ مرزا، سردیپ اور اس کے اسٹوڈیو کے چند آدمیوں نے اسے پہچان کر تالیاں بجائیں۔ اور صدر نے اس کا نام پوچھ کر اعلان کر دیا کہ "اب مسٹر کندن کما اسٹوڈیو میں کام کرنے والوں کی حالت کے بارے میں کچھ کہیں گے"

کہیں گے! کیا کہیں گے؟ چند لمحوں کے لئے کندن جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ سب بھول گیا۔ ہال میں اس کی نظروں کے سامنے کئی سو چہروں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا ـــ ایک لامتناہی، بے معنی سمندر۔ سانسوں کی لہریں۔ سگریٹ کے دھوئیں کے بادل۔ اور ان بادلوں میں ایک چہرہ پہلے سے

خوبصورت سے چاند کی طرح چمکتا ہوا ـــــ اندرا کا چہرہ! اور نہ جانے کیسے
اس مجمع میں اندرا کو دیکھتے ہی اس کی گھبراہٹ دور ہوگئی جیسے طوفانی سمندر
کو ایک دم سکون آجائے۔ اور اُسے یاد آگیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔
اس نے اوروں کی طرح دھواں دھار تقریر نہیں کی۔ انقلابی
جملے نہیں دہرائے۔ نہ جذبات کو ابھارا اور نہ دھمکیاں دیں۔ دھیمی آواز
اور دوستانہ بات چیت کے انداز میں اس نے بولنا شروع کیا۔ اور
جوں جوں وہ بولتا گیا سننے والوں نے اپنے آپ کو ایک اسٹوڈیو میں پایا
جہاں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ نظر کو خیرہ کرنے والی سیکڑوں روشنیاں جگمگا
رہی تھیں "لائٹس آن۔ لائٹس آف۔ بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ" کی آوازیں آرہی
تھیں۔ کبھی اندھیرا۔ کبھی اُجالا۔ اور چالیس پچاس فٹ اونچائی پر اسٹوڈیو
کی چھت میں لگے ہوئے گاڈروں اور کھانچوں سے کتنے ہی "لائٹ قلی"
چمگادڑوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے "لائٹس آن۔ لائٹس آف" اندھیرے
اُجالے کا یہ سارا کھیل اُن کے دم سے ہے۔ دن یا رات کے دس دس بارہ
بارہ گھنٹے وہ اسی طرح چھت میں لٹکے رہتے ہیں۔ اُن کو چائے پانی بھی
رسیوں کے جھولے کے ذریعے انہیں اوپر پہنچایا جاتا ہے۔ ہر لمحے اُن کی جان
خطرے میں رہتی ہے۔ اگر کوئی رسی ٹوٹ جائے! اگر کوئی قدم تختہ پر پھسل جائے
اگر تکان اور نیند سے چور ہو کر کوئی بے چارہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی اونگھ
جائے! اگر کسی بوسیدہ بجلی کے تار کو ہاتھ لگ کر خوفناک برقی رو بدن میں
دوڑ جائے! اگر کوئی من بھر وزنی لائٹ سر پر گر پڑے! ہر سال دو چار ایسے

حادثے" تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور اس پر بھی ان لائنٹ قلیوں کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کا صلہ پچیس تیس روپے ماہوار ملتا ہے۔ اگر کل میں اپنی ڈیوٹی کے وقت اوپر سے گر کر مر جاؤں تو یقین ہے کہ میری جیب سے یا میرے سامان کو بیچ کر بھی میرے کریا کرم کے لئے کافی رقم نہ مل سکے گی"

ہر شخص چپ چاپ کندن کی تقریر سن رہا تھا۔ کئی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور اندر اس انداز سے کندن کو دیکھ رہی تھی جس میں فخر بھی تھا اور رحم بھی!

"تو میں پوچھتا ہوں" کندن کی آواز بالآخر گونجی کہ "کیا ہم ہمیشہ یوں ہی بار برداری کے گدھوں کی طرح یہ ظلم برداشت کرتے رہیں گے؟ کیا ہم متحد ہو کر ان سیٹھوں اور مالکوں کا مقابلہ نہ کریں گے جو ہمارے گوشت پوست ہماری ہڈیوں اور خون سے اپنے رنگ محل بناتے ہیں؟ ... میں کہتا ہوں کہ تقریروں اور تجویزوں کا وقت گزر گیا ہے۔ عمل کی گھڑی آن پہنچی ہے میں چاہتا ہوں کہ آج ہم سب مل کر یہ طے کر لیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ بولئے کہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہے؟"

ہال میں خاموشی! خود کندن کو نہیں معلوم تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اگر حاضرین میں سے کسی نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تو اس کے لئے مشکل پڑ جائے گی۔

جواب سوچنے کے لئے تھوڑی مہلت پانے کی خاطر کندن اپنے سوالات کو دہراتا رہا "بولئے بولئے۔ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ کس طرح اپنی

متحدہ مانگوں کو منوانا ہے؟ ... کس ہتھیار سے اس انیائے اور ظلم کا مقابلہ کرنا ہے؟"

اور خاموش، ساکن ہال میں سے ایک مہین سی آواز آئی "اسٹرائک" اندرا کی آواز۔ ایک انقلابی نعرہ۔ طبل جنگ۔

اسٹرائک!

اسٹرائک!!

اسٹرائک!!!

اور فوراً یہ طے ہو گیا کہ ایک اسٹرائک کمیٹی بنالی جائے اور وہ تیاریاں شروع کر دے۔ اور جو الکان اپنے اسٹوڈیو کے ملازموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے ان کو اسٹرائک کی دھمکی دی جائے۔ اس کمیٹی میں کندن کو بھی رکھ لیا گیا۔ اور اس کے کامیاب اور بلا مقابلہ چناؤ پر خوب تالیاں بجیں۔ مرزا اور سروپ کو بھی اس کمیٹی پر ایکسٹرا کے نمائندوں کی حیثیت سے لے لیا گیا۔

جب کندن اپنی جگہ واپس پہنچا تو اس نے اندرا کی آنکھوں کو خوشی اور جوش سے چمکتا پایا۔ "آپ تو بڑے اچھے اسپیکر نکلے" اس نے کہا اور کندن کے ہاتھ کو نہایت تپاک اور گرمجوشی سے دبایا۔ اس نرم لمس میں مبارک باد بھی تھی اور محبت کا تقاضا بھی۔ "وہ" کا شانہ عشرت" والی جنسی محبت نہیں بلکہ وہ محبت جو دوست کو دوست سے اور ساتھی کو ساتھی سے ہوتی ہے۔

نواں ریل

(جس میں زہرِ عشق ٹنکچر آئیوڈین ثابت ہوتا ہے)

تمام اسٹوڈیو میں کھلبلی۔

نازنین واپس آ گئی۔ اپنے عاشق کے ساتھ جوہو کے ایک ہوٹل میں پکڑی گئی۔

نازنین واپس آ گئی۔ سنا ہے شادی کر لی تھی۔

نازنین واپس آ گئی۔ اندر بھی کوئی نہیں ملتا تھا۔ ایک فوجی لفٹنٹ کے ساتھ ... ...

نازنین واپس آگئی ۔ اس کی نانی چٹیا پکڑ کر لے آئی۔
نازنین واپس آگئی ۔ سنا اُس کی ماں نے بہت مارا۔
نازنین واپس آگئی ۔ لفٹنٹ اسحاق نے نازنین کی ماں سے
پچیس ہزار روپے لے کر طلاق دے دی ۔
نازنین واپس آگئی ۔ ماں اور نانی نے اس پر پہرہ لگا رکھا ہے
نازنین واپس آگئی ۔ سیٹھ صاحب نے اسے ڈائرکٹر باسو کے
فلم "سرخ سویرا" کے لئے منتخب کیا ہے ۔
نازنین واپس آگئی ! نازنین واپس آگئی !! نازنین واپس آگئی !!!
نازنین آج اسٹوڈیو آرہی ہے ۔

کندن دل ہی دل میں نازنین سے خفا تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ جائے اپنے لفٹنٹ کے پاس ــ بڑی مردانہ آواز والی "کملا" جس نے پچیس ہزار کے عوض اپنی محبت کو، نازنین کو، بیچ ڈالا! ... اس کے علاوہ وہ یونین کی کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے ساتھ اسٹرائک کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ مالکوں کی انجمن نے نہایت حقارت سے ان کی مانگوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ گریٹ آرٹ پکچرز کے سیٹھ سونا مل چاندی والے کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا "میرے اسٹوڈیو میں کوئی کمیونسٹ، سوشلسٹ مزدوروں کو بھڑکا کر دیکھے۔ سیدھا کر دوں گا سالوں کو"

کندن کو ہنسی آئی جب اُس نے اگلے دن ہی یہ اشتہار فلمی ہندستان

کے سرورق پر پڑھا:

سیٹھ سونامل چاندی والے

کی انقلابی پیش کش

سُرخ سویرا

انصاف اور جمہوریت کی صبح نو

آزادی کا پیغام

مزدوروں اور کسانوں کے لئے نوید جانفزا

خاص اداکار

نازک حسینہ نازنین ڈنّلی نیم،

خوبرو دیپ کمار

اور اب اندر ہی اندر اسٹرائک کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں، چندہ جمع کیا جارہا تھا۔ ممبر بنائے جا رہے تھے۔ وعدے لئے جا رہے تھے جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کے لئے دلوں کو مضبوط بنایا یا رہا تھا۔ کندن ہر ایک سے کہتا تھا: اگر ہم آٹے۔ میں اور اپنی یونین سے غداری نہ کریں تو ہمارا اسٹرائک ضرور کامیاب ہو سکتا ہے "

اندرا جس کو اس عرصے میں یہاں وہاں اکسٹرا کا کام ملنے لگا تھا ابھی اس کام میں پورا پورا حصہ لے رہی تھی۔ اکثر وقت جب ان کو اسٹوڈیو کا کام نہ ہوتا تو وہ دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ یونین کی تنظیم کے سلسلے میں اسٹوڈیو

اسٹوڈیو پھرتے۔ دادر سے پریل۔ تاردیو۔ اندھیری۔ گورے گاؤں۔ ملاڈ،
اندرا کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ سیکڑوں ایکسٹرا لڑکیاں یونین کی ممبر بن گئی تھیں اور جوش وخروش سے اسٹرائک کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھیں
میں باتیں اس کے لئے تیار تھیں کہ جب اسٹرائک شروع ہو تو اسٹوڈیوز
کے دروازوں پہ لیٹ جائیں گی تاکہ کوئی غدار کام پر نہ جا سکے۔

کندن نے جو کچھ سنا تھا، پڑھا تھا، فلموں میں دیکھا تھا اس کی بنا پر اس کا خیال تھا کہ محبت اس طرح ہوتی ہے، جیسے بجلی گرتی ہے۔ اچانک دل پہ چوٹ لگتی ہے اور عاشق دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آنکھیں معشوق کے جلوے سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ایک تیر جگر کے آر پار ہو جاتا ہے۔ اگر محبت ایسی ہوتی ہے تو یہ جذبہ کیا تھا جو اس کے اور اندرا کے درمیان پروان چڑھ رہا تھا؟ اس میں نہ شراب کی تندی تھی اور نہ دنیا کو فراموش کرنے والا نشہ۔ رفاقت کی چاشنی تھی۔ دوستی کا مزا تھا۔ مشترکہ دلچسپیوں اور مشترکہ خیالات کا بندھن تھا ایک ناقابل بیان ہلکی ہلکی سی کسک تھی۔ کیا محبت اسی کا نام ہے؟

رات کو کبھی کبھی، کچھ دیر پہلے نیند سے، یہ سوال کندن کے دماغ میں ابھرتا تھا لیکن دن کی مصروفیات میں وہ اسے بالکل بھول جاتا تھا۔ کمال یہ تھا کہ اندرا کے ساتھ ہونے پر بھی اس کو محبت نہیں ستاتی تھی۔ کبھی کبھار وہ سوچتا "آج اندرا کی پیشانی پر بندی کتنی خوشنما لگ رہی ہے" یا "آج اندرا کی باغیانہ زلفیں ہوا میں اڑ کر اس کے بیضوی چہرے کے گرد کتنا خوبصورت ہالہ بنائے ہوئے ہیں"۔ مگر جلد ہی ان باتوں کو بھول کر وہ اسٹرائک کا ذکر

کرنے لگتے۔ یونین کی سیاست پر بحث ہونے لگتی۔ اور محبت دماغ کے
پچھلے کونے میں دبک جاتی۔ مگر پھر بھی وہ بڑھتی رہی، پروان چڑھتی رہی!

جب سے مرزا، سردیپ، کندن اور اندرا یونین میں شامل ہوئے تھے
دادا گنجا نے ان سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ بلکہ سردیپ، کندن یا اندرا کوئی
قریب سے گزرتا تو وہ کوئی گندہ فقرہ ان پر کستا: "سالے بڑے کمیونسٹ
بنتے ہیں" "ساری سوشلزم ــــ کے راستے نکل جائیگی" "یہ یونین
بھی مرد پھنسانے کا اچھا چکلہ بنا ہے ان ایکسٹرا لونڈیوں نے" مگر مرزا
کے سامنے اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ایسی باتیں کرے۔ کیونکہ مرزا کا قد
چھ فٹ دو انچ تھا اور اس کے مگدر جیسے ہاتھوں کا ایک تھپڑ کافی تھا دادا گنجا
کو شمشان بھومی پہنچانے کے لئے! مرزا، دادا کے سامنے اکڑتے ہوئے نکلتا
اور زور سے کہتا ہے: "کون سالا ہے جو یونین کو گالیاں دیتا ہے۔ آئے نہ
میدان میں سامنے"۔ اور دادا منہ پھیر کر ان سنی کر دیتا اور خاموش رہتا۔ مگر
اب ان سب کو اور خصوصاً مرزا کو فلموں میں کام ملنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔ ہر
جگہ دادا گنجا نے پروپگنڈا کر رکھا تھا کہ یہ لوگ سوشلسٹ ہیں، کام کرنے
والوں کو بھڑکانے کی غرض سے اسٹوڈیو میں کام کرنے آتے ہیں، اس
لئے انہیں کام نہ دیا جائے۔

جب نازنین کی پیلی پیکارڈ اسٹوڈیو کے احاطے میں داخل ہوئی
تو کندن برآمدے میں کھڑا اندرا کا انتظار کر رہا تھا جو اب تک نہ آئی تھی۔ تقریباً
ہر شخص کی نظریں نازنین کے استقبال کو ادھر گھوم گئیں۔ "آج" ایک

فلم اسٹار ہی نہیں بلکہ زندگی کے ایک اصلی ڈرامے کی ہیروئن بن کر آ رہی تھی گھر سے فرار۔ شادی۔ طلاق ۔ ماں اور نانی کی مار۔ لعن طعن۔ رسوائی۔ آج وہ ان تمام منزلوں سے گزر کر آ رہی تھی۔ کندن نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے آنکھیں سوجی ہوئی ہیں جیسے روتی رہی ہو اور ان کے گرد کالے حلقے پڑے ہوئے ہیں، جیسے کئی راتوں سے سوئی نہ ہو۔ موٹر سے گزر کر وہ نیچی نظریں کئے سیدھی اپنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی اور اس کے پیچھے پیچھے ماں اور نانی کا باڈی گارڈ رہا۔

سیٹھ صاحب کی گھنٹی بجی اور کندن اندر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹرائک کے سلسلے میں شاید ڈانٹ پڑے۔ مگر سیٹھ سونامل چاندی والے نے کندن کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ موری کے کیڑے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا "ڈائرکٹر باسو کو یہاں بھیجو ... اور چنیا بائی اور منی جان کو بلاؤ"۔ کندن سمجھ گیا کہ آج "سرخ سویرا" کے کنٹراکٹ کی بات چیت ہونے والی ہے۔ ڈائرکٹر باسو کو سیٹھ جی کا پیغام پہنچا کر وہ نازنین کے ڈریسنگ روم پہنچا اور دونوں بوڑھیوں کو یہ مژدہ سنایا کہ سیٹھ جی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سن کر خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دریائی گھوڑوں کی طرح انھوں نے اپنے موٹے چربی چڑھے ہوئے جسموں کو نہایت مشکل سے گدے دار کرسیوں پر سے اٹھایا اور سیٹھ جی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ نازنین دیوار پر لگے ہوئے آئینے کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کندن کو یہ کیسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس لئے وہ چند قدم جا

کر لوٹ آیا۔

"آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں"

"ہاں میرے پاؤں میں چوٹ لگ گئی ہے۔ ٹنکچر آیوڈین چاہیے۔ ذرا مہربانی کر کے مجھے دفتر سے فرسٹ ایڈ باکس لا دیجئے"

کندن بھاگ کر فرسٹ ایڈ باکس لے آیا۔ نہ جانے کیوں نازنین کا اداس، پیلا چہرہ دیکھ کر اس کا دل ہمدردی اور رحم سے بھر آیا تھا۔ بیچاری! محبت کی پہلی ہی منزل میں ٹھوکر کھا آئی۔ اس نے کہا "کہئے تو میں دوا لگا کر پٹی باندھ دوں"

"نہیں میں خود لگا لوں گی۔ آپ یہ بکس یہیں چھوڑ جائیں"۔ اور جب کندن جانے لگا "شکریہ۔ آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی!"

کتنا فرق تھا اس چاندی کے روپے کی حقارت بھری جھنکار میں اور اس درد بھری، درد آشنا آواز میں! مگر کندن یہ نہ سمجھ سکا کہ اتنے معمولی سے کام کا اتنا زبردست شکریہ کیوں؟

سیٹھ جی چنیا بائی سے کنٹراکٹ کی شرائط پر بحث کر رہے تھے "ناشنے ہزار! چنیا بائی ہم سے ایسی باتیں کرتی ہو۔ ابھی "تتلی" میں چالیس ہزار پر کام کر چکی ہو۔ اس کے بعد یہ سب بڑھا دی۔ سب پیپرز میں کتنا نام نکلا ہے۔ میں تو سوچتا تھا نہ یوں پھر سوچا اپنی پرانی آرٹسٹ ہے۔ پھر آپ لوگوں سے بھی پرانا سنبندھ ہے۔ "تتلی" والی رقم ہی سہی۔ اس سے زیادہ تو ..."

"اب تو اس سے زیادہ ہی دینا پڑے گا سیٹھ صاحب۔ جیسے آپ

بدنامی کہتے ہیں یہ تو پبلسٹی ہے۔ کیا مجھے ؟ سارے ملک کا کوئی ایسا اخبار نہیں ہے جس میں پچھلے دس دن میں نازنین کا نام نہ چھپا ہو۔"

"مگر بدنامی ...." سیٹھ نے چنیا بائی کے الفاظ کے بہاؤ کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔

"بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا ؟" منی جان نے لقمہ دیا۔ "پچپن ہزار سے تو ہم ایک کوڑی کم نہ لیں گے۔ کل ہی چندولال شاہ کا ٹیلیفون ...."

"اچھا چلو تمھاری خاطر پچپن کئے دیتا ہوں میں" سیٹھ نے جلدی سے کہا۔

اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے چنیا بائی بولی "خیر تمھارا پکچر ہے سو منظور کئے لیتے ہیں مگر ٹیکس تمھیں ہی بھرنا پڑے گا"

"وہ تو میں ہمیشہ ہی بھرتا ہوں۔ اچھا بلاؤ نازنین کو کنٹراکٹ پر دستخط ہو جائیں"

"ڈریسنگ روم میں ہے۔ کسی کو بھیج دو"

گھنٹی ۔ "کندن مس نازنین کو بلاؤ"

کندن ڈریسنگ روم پہنچا تو اندر سے کواڑ بند پائے کھٹ کھٹایا کوئی جواب نہیں۔ پھر کھٹ کھٹایا۔ دھڑدھڑایا اور کئی آدمی جمع ہو گئے۔

آخر نازنین کو کیا ہوا کہ دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

جب پانچ منٹ تک کوئی جواب نہ ملا تو میٹنگ ڈیپارٹمنٹ کے

دوستوں نے دروازے پر شانے لگا کر زور سے دھکا دیا۔ پتلی لکڑی کے پٹ کھل گئے۔

اند نازنین بے ہوش پڑی تھی۔ ہاتھ صوفے پر سے فرش پر آ رہا تھا۔ اس ہاتھ کے قریب ٹنکچر آئیوڈین کی شیشی خالی پڑی تھی۔

کندن کے کان میں ایک درد بھری، درد آشنا آواز آئی: "شکریہ آپ کا احسان کبھی نہ بھولوں گی"۔

دسواں ریل

(جس میں ہیرو ہیروئن کی شادی طے ہوجاتی ہے مگر ——)

"آپ کو ماتا جی نے ملنے کے لئے بلایا ہے"۔ اندرا نے کسی قدر شرما کر کندن سے کہا۔

"کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم"

شام کو اسٹرائک کمیٹی کی میٹنگ تھی جس میں طے ہوا کہ چار دن بعد یعنی اگلے سوموار سے ہر اسٹوڈیو میں اسٹرائک کر دیا جائے گا۔ اس سے فراغت

پاکر کندن اندرا کے گھر پہنچا۔ اب یہ تاریک گلی اس کے لئے غیر معروف نہ
رہی تھی۔ اندھیرے میں بھی وہ راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ آج یہاں سے
گزرتے ہوئے اس نے سوچا۔ چند مہینے پہلے کیا معلوم تھا کہ میرے
سہانے خوابوں کی تعبیر ایسے ماحول میں پائی جائے گی۔ کہاں نازنین کا میرین
ڈرائیو والا محل نما مکان اور کہاں اندرا کی کال کوٹھری! مگر عجیب بات یہ تھی
کہ پھر بھی کندن کو کوئی افسوس نہ تھا۔ اس کی زندگی میں، اس کے جذبات اور
محسوسات میں، اس کی امیدوں اور آرزوؤں میں اندرا اس طرح سما گئی
تھی کہ اس کے بغیر رہنا اور کام کرنا کندن کو ناممکن نہیں تو مشکل اور بے مزا
ضرور معلوم ہوتا تھا۔

اندرا اور اس کی ماں انتظار کر رہی تھیں۔ گڑ کی چائے تیار تھی،
چائے پی کر کندن نے پوچھا "کیوں ماتا جی کیا بات ہے؟" اندرا کی ماں نے
بیٹی کی طرف دیکھا۔ پھر کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی۔ مگر کوئی جگہ ایسی نہ
پائی جہاں اندرا جا کر بیٹھ جائے تاکہ اس کی ماں وہ بات کندن سے کر سکے
جو ہندستانی گھرانوں میں بیٹی کی موجودگی میں نہیں کی جاتی۔ اندرا خود اٹھ کر کونے
میں چلی گئی جہاں دال کی ہنڈیا چولہے پر چڑھی ہوئی تھی اور بے ضرورت ڈوئی
چلانے لگی حالانکہ اس کے شرم سے تمتماتے ہوئے کان ماں اور کندن کی طرف
ہی لگے ہوئے تھے۔

"بیٹا، شرم آتی ہے تم سے یہ بات اس طرح کرتے ہوئے"۔ اندرا کی
ماں نے بات کرنی شروع کی "مگر کیا کریں۔ حالت ایسی ہے کہ کہنا ہی

پڑتا ہے "

"کہو، ماتاجی، جو کہنا ہے مجھے گھر کا آدمی ہی سمجھو "

"بیٹا تم تو فلم کمپنی کا حال مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ سنا ہے وہ ایکٹرس جو ہے نازنین، اس نے زہر کھا لیا تھا "

"ہاں مگر ڈاکٹروں نے اسے بچا لیا ہے۔ تین چار مہینے میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی "

"یہی میں نے بھی سنا ہے۔ اندرا کہتی ہے کہ سیٹھ نازنین کی جگہ کسی دوسری ایکٹرس کی تلاش کر رہا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو، اندرا وہ کام کر سکتی ہے؟ "

"کیوں نہیں۔ میک اپ کے بعد اندرا بھی نازنین جیسی خوبصورت نظر آئے گی۔ اور سمجھ بوجھ اندرا میں زیادہ ہے اس لئے بہت جلد ایکٹنگ سیکھ سکتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سیٹھ کسی نئی لڑکی کو ہیروئن کا پارٹ نہیں دے گا "

"مگر سیٹھ تیار ہے "

کندن کو یقین نہ آیا۔ ناممکن ہے کہ سیٹھ سونا مل چاندی والا ایک مشہور اسٹار کا پارٹ ایک گمنام لڑکی کو دے دے "تم سے کس نے کہا ماں؟ "

"وہ جو اندر گپتا ہے نا۔ وہ آیا تھا اندرا کے باپ کے پاس۔ کہنے لگا سیٹھ نے اندرا کو دیکھا ہے اور اسے اپنی نئی فلم میں نازنین کی جگہ ہیروئن کا پارٹ دینے کو تیار ہے ... "

دادا گنجا کا نام سن کر کندن کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر یہ خبر اتنی شاندار اور سنسنی خیز تھی کہ چند لمحوں کے لئے وہ اس ذلیل اکسٹرا سپلائر اور اس کی رکیک چالوں کو بھول گیا "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، ماں۔ اندرا اسٹار بن جائے گی، ہزاروں روپے ماہوار کمائے گی "

" نہیں، بیٹا، شریفوں کے لئے یہ مر جانے والی بات ہے۔ سیٹھ اندرا کو یوں ہی پارٹ نہیں دے گا۔ دادا گنجا تو صاف کہہ گیا ہے کہ یہ پارٹ لینا ہے تو اندرا کو سیٹھ کی ... "

" ماں! "

" ہاں بیٹا۔ تم فلم کمپنی میں کام کرتے ہو مگر خود شریف ہو اس لئے ان سیٹھوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتے۔ مرزا تو اس کا ہے کہ اندرا کے باپ نے دادا گنجا سے وعدہ کر لیا ہے۔ اور اندرا کہتی ہے میں زہر کھا لوں گی پر اپنی عزت نہ بیچوں گی "

کندن کی نگاہ اس کونے کی طرف گئی جہاں اندرا چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ شرم سے سر جھکائے تھی اور شاید اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کندن کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک شرابی باپ اور ایک غریب مدقوق ماں کی بیٹی اندرا نہیں بلکہ سیتا تھی، ساوتری تھی، دمینتی تھی — ہندوستانی عورت کی عفت و عصمت کی مقدس روح تھی۔ وہ ہرگز اس کے قابل نہیں تھا۔

" تو بیٹا اب اندرا کی لاج تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ میں نے تو جس دن

تمھیں پہلی بار دیکھا تھا اسی دن بیٹا بنا لیا تھا۔ اندرا نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا ہے پر میں جانتی ہوں وہ بھی تمھیں پسند کرتی ہے۔ اگر تم اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ لے لو تو میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں "

شادی کی تجویز! پریم بندھن! بیاہ! گرہستی! دو دل ایک ہو جائیں گے! لیکن اس وقت کندن کے دماغ میں اس تجویز کا کوئی رومانی پہلو نہ آیا۔ روپے آنے پائی کا مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

تیس روپے ماہوار۔ بمبئی میں مکان عنقا۔ میاں بیوی رہیں تو کہاں۔ "پگڑی" کی رقم کہاں سے آئے؟ اسٹوڈیو میں اسٹرائک۔ شاید تیس روپے ماہوار بھی نہ ملیں۔ بے کاری۔ بھوک۔ بیوی۔ بچے ... کسی صورت سے ایک رومانی تصویر بنتی نظر نہ آتی تھی۔

" مگر ماں میری کوئی آمدنی نہیں ہے ... " اس نے کہنا شروع کیا " اندرا کو تکلیف ہو گی "

" بیٹا۔ لاج بیچنے سے زیادہ عورت کو اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی "

کندن لاجواب ہو گیا۔

" اچھا، ماں، میں کل جواب دونگا۔ پر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری حالت بہتر ہوتی تو یہ بات میں خود کرتا۔ میں اسی لئے چپ تھا کہ آمدنی کی کوئی صورت ہو جائے تو کہوں گا۔ اب تم نے بات کی ہے تو میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا "

اٹھتے ہوئے اس کی نگاہ ایک بار پھر اندرا پر پڑی جو ابھی تک چولھے کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اور شعلوں کی پرچھائیں اس کی آنکھوں

امیدیں کر چکا ہی تھی۔ آج وہ اسے چھوڑنے اور چراغ دکھانے زینے تک نہ آئی اور پھر بھی کندن کو یہ اچھا لگا۔ آج وہ دلہن بن گئی تھی۔

اُس رات اسے نیند نہ آئی۔ اُس رات اس نے اسٹرائک کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ پلنگ پر لیٹا وہ اندرا کا تصور کرتا رہا۔ اندرا۔ سمجھدار اندرا۔ نرم و نازک اندرا۔ مہربان اندرا۔ محبت کرنے والی اندرا۔ محبت کرنے کے قابل اندرا۔ ایک ذہین دماغ۔ ایک ہمدرد دل۔ ایک دل پسند جسم۔ کتنی آرزوؤں اور حسرتوں کا گہوارہ۔

اور صبح جب وہ اسٹوڈیو گیا تب بھی وہ اسٹرائک کے بارے میں نہیں اندرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کہیں سے اسے ہزار دو ہزار روپے مل جائیں۔ کوئی اسے سو دو سو روپے کی نوکری دے دے۔ تو وہ فوراً اندرا کو بیاہ کر گھر لے آئے۔ اس کی اندھیری زندگی میں اجالا ہو جائے۔ مگر کہاں سے اور کون؟

سروپ نے پوچھا: "آج اسٹرائک کمیٹی کا جلسہ کے بجے ہے" اور کندن نے غیر حاضر دماغ سے جواب دیا: "ہاں ہے تو شاید"

مرزا نے کہا: "ہر کوشش ہونا چاہئے۔ سنا ہے وہاں کے کام کرنے والے اسٹرائک کے بارے میں ڈھل مل ہو رہے ہیں"۔ کندن نے غیر ضروری ترشی سے [illegible] "تو کیا میرے ہی سر پر سب کام کی ذمہ داری ہے۔ تم لوگ کیوں نہیں [illegible] آتے"

رام ملاتو نے کہا: "دیکھو کندن ذرا خبردار رہنا۔ ہمارے اسٹوڈیو

ہی میں سیٹھ کا پانچواں وسستہ کام کر رہا ہے۔ اسٹرائک کو ناکام کرانے میں وہ
کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

کندن نے جواب دیا "کیوں خواہ مخواہ گھبرائے جاتے ہو۔ میں دیکھ لونگا۔"
مگر اس کی توجہ کہیں اور تھی، اُس نے یہ سنا ہی نہیں تھا کہ رام نے کیا کہا۔

اُس دن اندرا اسٹوڈیو میں نظر نہ آئی اور کندن کو کوئی تعجب نہ ہوا۔
آج وہ گھر سے نہ نکلے گی۔ جب تک وہ جواب سے کر نہ جائے گا وہ گھر بیٹھی
رہے گی۔

ساڑھے دس بجے سیٹھ آیا۔ کندن سے کہا۔ "ڈائرکٹر باسو کو بلاؤ۔ کندن
رور انتظار کرتا تھا کہ کب سیٹھ اس سے اسٹرائک کے بارے میں کچھ کہے گا۔
بُرا بھلا کہے گا۔ گالیاں دے گا۔ شاید مار سے پیٹے۔ اسٹوڈیو سے نکال
دے۔ مگر سیٹھ نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ کئی گھنٹے تک بند
کمرے میں باسو سے سکوٹ ہوتی رہی۔ کندن جانتا تھا کہ وہ "سرخ سویرا"
کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں کہ نازمین کی جگہ کون سی ہیروئن لی
جائے اور دادا گنجا کی گندی تجویز کا خیال کر کے کندن کا چہرہ غصے اور شرم
کے مارے سرخ ہو گیا۔

ایک بجے سے کچھ پہلے باسو نکل کر اپنے کمرے میں گیا۔ گھنٹی بجی اور
کندن سیٹھ کے کمرے میں داخل ہوا۔

"کندن!"

"جی سیٹھ صاحب"

"بیٹھ جا"

کندن بیٹھ گیا۔ اب سیٹھ اسٹرائک کے بارے میں کچھ کہے گا۔ کندن بھی تیار تھا "تم سیٹھ لوگ اپنی پروڈیوسرز ایسوسی ایشن بنا سکتے ہو تو ہم مزدور بھی اپنی یونین بنائیں گے۔ تم ہمارا خون چوستے ہو۔ ہماری محنت سے لاکھوں کروڑوں بناتے ہو اور ہمیں چاندی کے چند ٹکڑے دیتے ہوئے تمہیں موت آتی ہے۔ ہم جانتے ہیں، کمزور ہیں، مفلس ہیں مگر اتحاد میں ہماری قوت ہے اسٹرائک ہمارا اعلانِ جنگ ہے"، کندن نے اپنی تقریر سوچ رکھی تھی۔

مگر سیٹھ نے اسٹرائک کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ایک لفظ نہیں

"کندن!"

"جی سیٹھ صاحب"

"کہاں تک پڑھا ہے"

"میٹرک تک"

"انگریزی آتی ہے"

"آتی ہے جی مگر زیادہ نہیں"

"سیٹ پر کنٹینوٹی لکھ سکتا ہے؟"

"ایک دو دن میں سیکھ سکتا ہوں"۔ مگر یہ سب سوال کیوں؟ کندن کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"باسو صاحب کو ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔

"جی؟"

"میرے خیال میں تم کام کر سکتے ہو"

"جی۔ پوری کوشش کروں گا"

"ہمیں ایسے ہی نوجوان چاہئیں۔ جو محنت کریں اور کسی گڑبڑ میں پارٹ نہ لیں"۔

کندن چند لمحوں کے لئے "گڑبڑ" کا مطلب نہ سمجھا۔

"تنخواہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار ہوگی"

اسسٹنٹ ڈائرکٹر! ڈیڑھ سو روپے ماہوار! اب وہ اندرا سے شادی کر سکے گا۔ کندن کی آنکھوں کے سامنے رنگین نظارے گھومنے لگے۔

"پرسوں سوموار سے کام شروع ہو جائے گا"

"بہت اچھا"

"اب تم جا سکتے ہو۔ کل سے تم چپراسی نہیں ہو۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہو۔"

کندن دفتر سے باہر نکلا تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عمر بھر کی امیدیں آرزوئیں ایک بار ہی پوری ہو گئی ہوں۔ وہ مسرت کی فضا میں اڑ رہا تھا۔ مگر دفعتاً وہ دھماکے کے ساتھ زمین پر آ رہا۔

منگو، ایک سینٹنگ قلی نے آکر کہا "کندن بابو۔ رات کو نو بجے میٹنگ ہے اسٹرائیک کمیٹی کی۔ رام صاحب نے کہا تھا آپ سے کہہ دوں"

اسٹرائک!
اسٹرائک کو تو وہ بھول ہی گیا تھا!
اب اس کی سمجھ میں آیا کہ "گڈ بائی" سے سیٹھ کا کیا مطلب تھا۔
اب اسے معلوم ہوا کہ ایک سابق لائنٹ قلی اور حال چپراسی کو یک لخت اسسٹنٹ ڈائرکٹر کیوں بنایا جا رہا تھا۔
اب اسے یاد آیا کہ وہ ابھی ابھی ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر اپنا ضمیر بیچ آیا تھا۔
اب اس کی سمجھ میں آیا کہ سیٹھ نے سوموار سے کام کرنے کو کیوں کہا ہے!
اس کا جی چاہا فوراً واپس جا کر سیٹھ کی ذلیل رشوت اس کے منہ پر دے مارے۔ کیا وہ سمجھتا ہے وہ ایک خوددار مزدور کی عزت چاندی کے ٹکڑوں سے خرید سکتا ہے۔
مگر اس کے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اندرا! اگر اس نے سیٹھ سے لڑائی کر لی تو پھر اندرا سے شادی کیسے کر سکے گا؟ نوکری، روپے، شادی مسرت ہر چیز کا دار و مدار سیٹھ کی خوشنودی پر تھا۔
اس نے منگو سے کہا۔
"کہہ دینا مجھے رات کو کام ہے۔ میں میٹنگ میں نہ آ سکوں گا"
وہ اسٹوڈیو سے باہر نکل کر ٹرام اسٹیشن کی طرف چلا۔

دور سے اُس نے رام اور مرزا کو باتیں کرتے ہوئے آتے دیکھا اور پان والے کی دکان کے برابر میں دبک گیا تاکہ وہ اسے نہ دیکھ پائیں ۔ جب وہ گزر گئے تو وہ نکلا ۔ اور جب تک شام میں سوار نہ ہو گیا دھڑکتے ہوئے دل سے اِدھر اُدھر مڑ مڑ کر دیکھتا رہا ... جیسے چور .

گیارھواں ریل

(جس میں آخر کار ہیرو اور ہیروئن مل جاتے ہیں
——— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے)

سوموار

آج گریٹ آرٹ پکچرز کے "تازہ ترین شاہکار" سرخ سویرا" کی مہورت تھی۔ پروہت نے ستاروں سے دریافت کر کے دس بج کر ۲۵ منٹ کا وقت مقرر کیا تھا۔

اسٹوڈیو میں چہل پہل تھی۔ کیمرے پر ہار پھول چڑھے ہوئے تھے۔

سیٹ پر ایک کونے میں برہمن بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ سیٹھ صاحب شارک
سکن کا کوٹ پہنے ماتھے پر چندن لگائے خوش خوش گھوم رہے تھے۔
ڈائرکٹر باسو کے تمام دانت باہر نکلے پڑ رہے تھے۔ اور سب سے زیادہ
خوش کندن تھا۔ آج وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ چند سال میں ڈائرکٹر ہو گا۔

مگر اسٹوڈیو میں بعض چہرے مغموم بھی تھے۔ بڑھئی، قلی، میک
اپ کرنے والے۔ اور چند جانے پوجھے چہرے غائب بھی تھے۔ رام اور چوپڑہ
کو نکال دیا گیا تھا۔ مرزا اور سروپ کا داخلہ بند کر دیا گیا تھا۔ اسٹرائک فیل
ہو گیا تھا۔ کندن کے استعفیٰ کے بعد یونین کے کتنے ہی ممبروں نے ساتھ
چھوڑ دیا تھا۔ اتحاد کی عمارت اڑاڑا دھم کر کے گر پڑی تھی۔ مالکوں کی فتح
ہوئی تھی اور مزدوروں کی شکست۔

کندن خوشی خوشی مہورت کا انتظام کر رہا تھا۔ یہاں سے فراغت
پاتے ہی وہ اندرا کے ہاں جائے گا۔ اُسے مہورت کے پیڑے کھلائے
گا۔ آج نہ صرف "سرخ سویرا" کی مہورت تھی بلکہ کندن کی نئی زندگی کا بھی
افتتاح تھا۔ آج وہ ماں سے بیاہ کی تاریخ مقرر کرائے گا۔ اور پھر وہ اور
اندرا دوسرے ایک ہو جائیں گے۔ خوشی کے اس لمحے میں اُسے دادا گنجا کا
گھناؤنا چہرا نہایت نامبارک معلوم ہوا۔ یہ کم بخت آج کیوں ٹپک پڑا تھا
مگر دادا اس شان سے اسٹوڈیو میں پھر رہا تھا۔ جیسے آج کا ہیرو وہ ہی ہو
سیٹھ کو کونے میں لے جا کر نہایت بے تکلفی سے باتیں کیں اور پھر ساتھ لے
کر سیٹھ کے پرائیویٹ دروازے سے اس کے دفتر میں چلا گیا۔

جتنے لوگ موجود تھے سب کی زبان پر ایک ہی مضمون تھا۔ سیٹھ صاحب نے ہیروئن کون سی منتخب کی ہے۔ سنا تھا کوئی بالکل "نیا چہرہ" ہے کوئی کہتا ایک بڑے گھرانے کی "سوسائٹی گرل" ہے۔ کسی کا بیان تھا ایک رجواڑے کی شہزادی ہے۔ دو چار کا خیال تھا نرمل اب اچھی ہو گئی ہے اور ڈرامائی انداز میں آخری لمحے پر مہورت کے لئے آ جائے گی۔ سیٹھ صاحب نے اپنے سکریٹری تک کو اس راز میں شریک نہ کیا تھا۔

مہورت کے وقت میں پندرہ منٹ رہ گئے۔ برہمن اشلوک زور زور سے پڑھنے لگے۔ اتنے میں دروازے کے قریب کچھ شور ہوا تو کندن اُدھر بھاگا۔ وہاں دیکھا کہ نرمل کو تین چار آدمی پکڑے ہوئے ہیں اور وہ اُن سے اکیلا لڑ رہا ہے۔ باغی ادیب کی حالت عجیب تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی، آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی، جیسے وہ نشے میں ہو یا روتا رہا ہو اور وہ چلا رہا تھا "یہ فلم نہیں بنے گا۔ میں اپنے نام کو چاندی کے ٹکڑوں کے عوض نہیں بیچوں گا۔ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ یہ میری کہانی نہیں ہے۔ سرخ سویرا مزدوروں کے خون کی شفق ہے، سرمایہ داری کے گھناؤنے چہرے کا غازہ نہیں ہے"

"بیچارہ پاگل ہو گیا ہے" کندن نے سوچا اور اسے بچانے کی غرض سے آگے بڑھا۔ مگر ڈائرکٹر باسو اس سے پہلے، وہاں پہنچ چکا تھا۔

"اسے نرمل بابو یہ کیا گول مال ہے"

"خونی۔ تو نے ہی میری کہانی کا قتل کیا ہے۔ میرے خیالات اور

جذبات کا گلا گھونٹا ہے۔ میری کہانی واپس کرو ... "

" نرمل بابو۔ مت بھولو کہ تمھیں ہزار روپے اڈوانس دیئے جا چکے ہیں۔ اب کہانی ہماری ہو چکی ہے "

" یہ لو اپنے ہزار روپے " اور یہ کہہ کر نرمل نے اپنے کوٹ کی جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کا ایک پلندا نکال کر ہوا میں اڑا دیا۔ اور بہت سے لوگ انھیں اٹھانے کے لئے دوڑے۔

" یہ کیا ؟ " باسو حیران اور ششدر رہ گیا۔ روپے کی یہ تحقیر یہ کسی پاگل ہی کا کام ہو سکتا ہے " نرمل بابو۔ کیا پاگل ہو گئے ہو۔ روپے کو اس طرح پھینکتے ہو ... "

" روپیہ مردے کو زندہ نہیں کر سکتا " نرمل نے دھیمی، آنسوؤں سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا " روپیہ میری بیوی مجھے واپس نہیں دلا سکتا میں نے روپے کی خاطر اپنا ضمیر، اپنا آرٹ بیچ دیا۔ اس لئے وہ خفا ہو کر چلی گئی "

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور باسو کے اشارے سے چند قلی اُسے پکڑ کر اسٹوڈیو کے باہر کر آئے۔

" ہیروئن آ رہی ہے۔ ہیروئن آ رہی ہے! " تمام اسٹوڈیو کی توجہ اب پاگل ادیب سے نئی ہیروئن کی طرف مبذول ہو گئی۔

سیٹھ صاحب کے کمرے کا پرائیویٹ دروازہ کھلا اور پہلے دادا گنپا فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہوا نکلا۔ اُس کے بعد سیٹھ ــــ وہ بھی مسکراتا،

اپنے اندرونی دانتوں کی نمائش کرتا ہوا۔ اور اس کے بعد ایک قیمتی، بھڑکدار بنارسی ساڑھی میں ملبوس ——— اندرا!

کندن کے دماغ میں اچانک اور غیر متوقع حادثے کا وہ جھانج بجا جو ایسے فلمی موقعوں پر بیک گراؤنڈ میوزک والے بجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ سوچنے، سمجھنے، بولنے کے ناقابل ہو گیا۔ جب اندرا اس کے قریب سے گزری تو اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے چہرے پر پاؤڈر اور پینٹ کی ایک نقاب ڈال لی ہے جس کے پیچھے اس کے جذبات چھپے ہوئے تھے۔ بغیر کندن کو پہچانے وہ قریب سے گزر گئی۔

"کندن!" ڈائرکٹر پاس چلایا: "یہ ڈائلاگ لو اور لکشمی دیوی کو یاد کرا دو۔ ہورت شاٹ میں بولنا ہوگا"

"لکشمی دیوی؟" کندن نے یہ نام آج ہی سنا تھا۔

"ہاں ہاں۔ نئی ہیروئن۔ جلدی کرو۔ دس منٹ رہ گئے ہیں"

کاغذ پر یہ مکالمہ لکھا ہوا تھا: "یاد رکھو، امر، نئی دنیا بلیدان دیئے بغیر نہیں بن سکتی۔ سرخ سویرا دیکھنے کے لئے ہمیں اپنے خون کی لالی دینی پڑے گی" اور کندن کو یاد آیا کہ تمام کہانی میں نرمل کا لکھا ہوا صرف یہی ایک مکالمہ باقی رہ گیا تھا۔ آج ہورت شاٹ کے لئے اس وجہ سے رکھا گیا تھا کہ اس میں "سرخ سویرا" تھا۔

"اندرا!" وہ اکیلی بیٹھی تھی اپنی زرق برق ساڑھی میں ایک شہزادی

کی طرح۔ اور وہ ڈائلاگ سکھانے کے بہانے سے اُس سے بات کر سکتا تھا۔" اِندرا! تم نے یہ کیا کیا؟ پیسے، نام، ریشمی ساڑھیوں کی خاطر اپنی لاج بیچ ڈالی۔"

اِندرا کا جواب سن کر کندن کے دل اور دماغ پر بجلی گر پڑی۔

"لاج بیچنے کا گُر تم ہی نے مجھے سکھایا ہے"

"اِندرا!"

"ہاں۔ جو اسٹرائک تمھاری غداری کی وجہ سے فیل ہو گیا۔ وہ ہمارا آخری موقعہ تھا کہ اس فلمی دنیا میں ہم عزت کے ساتھ رہ سکیں ... اب کوئی امید نہیں ہے"

کندن اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کا کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اِندرا کی ذلت کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اور یہ سوچ کر کندن کا جی چاہا کہ وہ پاگلوں کی طرح ہنسے کہ اُس نے اپنے خیال میں یہ غداری اندرا کی خاطر کی تھی۔

"کندن! آلم ہوگیا"، ڈائرکٹر یاسو چلّایا۔ اندرا اٹھی اور کیمرے کے سامنے چلی گئی۔

"بتی جلاؤ"

"بتی بجھاؤ"

"لائٹس آن۔ لائٹس آف"

"نمبر چوبیس"

"نمبر اٹھارہ"

"سولہ نمبر اوپر لو"

"ستائیس نمبر یار ڈ کرو"

"ساؤنڈ ریہرسل"

"اوکے فار ساؤنڈ"

"ریڈی فار ٹیک"

اور پھر باسو کی آواز۔

"چند و بھائی۔ اپنے کو وہ لائٹ الفکٹ مانگتا۔ وہی لائٹ کا سرکل جیسا پچھلی پکچر کے لاسٹ شاٹ میں لیا تھا"

"اس کے لئے ٹائم نہیں ہے، صاحب۔ ٹاپ لائٹ کو نیچے کرنا پڑے گا"

"اُس وقت بھی تو کیا تھا۔ کندن!"

"جی، باسو صاحب"، کندن کی آواز چالیس فٹ اونچے سے آئی۔ وہ لوہے کے گاڈروں کے ایک کھانچے میں ایک فٹ بھر چوڑے لکڑی کے تختے کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔

باسو کے لئے وقت نہیں تھا کہ پوچھے اس کا اسسٹنٹ وہاں کیا کر رہا ہے۔ وہ چلایا "لائٹ کو نیچے کر سکتے ہو؟"

"کر سکتا ہوں، صاحب"۔ یہ کہہ کر اس نے رسی کھول کر لائٹ کو اپنے ہاتھ کے سہارے نیچے لٹکا دیا۔

"او کے"

"ریڈی فار ٹیک"

"ساؤنڈ اسٹارٹ"

دو سیٹیاں۔

"گو"

کندن کو اتنی اونچائی پر سے تمام اسٹوڈیو ایسا نظر آرہا تھا۔
جیسے وہ آسمان کی بلندی سے دنیا کو دیکھ رہا ہو۔ کہیں اندھیرا کہیں
اُجالا۔ اندھیرا زیادہ تھا اور روشنیاں کم۔ مگر پھر بھی وہ چمک رہی تھیں
ہنس رہی تھیں۔ گویا اُسے اپنی طرف بلا رہی ہوں۔

دور بہت دور سے آواز آئی۔ کسی کی جانی بوجھی آواز۔

"یاد رکھو، کندن نئی دنیا بلیدان دیئے بغیر نہیں بن سکتی،
سرخ سویرا دیکھنے کے لئے ہمیں اپنے خون کی لالی دینی پڑے گی"

یاد رکھو کندن! یا یاد رکھو، امر! اُس نے کیا کہا تھا؟ یا یہ کندن
کے کانوں کا قصور تھا؟۔ یا اس کا دماغ ٹھیک نہیں رہا تھا؟

دور، بہت دور سے آواز آئی۔

"کٹ"

اور دفعتاً تمام زمین کی روشنیاں بجلی کی تیزی سے کندن
کی طرف لپکیں۔ اور اُجالے کا ایک سورج اتنی ہی تیزی سے
اندما کی طرف۔ اور ایک لمحے میں وہ دونوں اکٹھے اندھیرے

اجالے کے سمندر میں ڈوب گئے ——— ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

ڈائرکٹر باسو کی آواز اسٹوڈیو میں گونجی۔
"لائٹس آف!"

FADE OUT